نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ ار

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دیگئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، مذہبی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند، انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۷۲۰ صفحات۔ مجلد۔ سات روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

مذہبی استفسارات وجوابات
یعنی

من و یزداں کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسایل پر حضرت نیازؔ نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:- اصحاب کہف ــ معجزہ و کرامت ــ انسان مجبور ہے یا مختار ــ مذہب و عقل ــ طوفان نوح ــ خضر کی حقیقت ــ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں ــ یونس اور دہان ماہی ــ حسن یوسف کی داستان ــ قارون ــ سامری ــ علم غیب ــ دعا و توبہ ــ لقمان ــ عالم برزخ ــ یاجوج ماجوج ــ ہاروت ماروت ــ حوض کوثر ــ امام مہدی ــ نور محمدی اور پل صراط ــ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۲۴ صفحات ــ کاغذ سفید دبیز۔
قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

خریدارانِ نگار اور ایجنٹ صاحبان پہلے سے پڑھ لیں

حضرت نیاز فتحپوری کی ایک معرکۃ الآرا جدید تالیف

جو بطور ضمیمہ آیندہ جنوری ۱۹۵۵ء سے ہر مہینے شایع ہوتی رہے گی اور عرصہ تک اس کا سلسلہ جاری رہے گا۔

"دُنیا کا مستقبل کیا ہے" — "صنعت و دولت کی ہوس کا انجام کیا ہوگا" — "سائنس کی ترقی انسان کو کس طرف لئے جا رہی ہے" — اور سب سے زیادہ یہ کہ "دُنیا میں واقعی کبھی امن و سکون قایم ہونا ہے یا نہیں"۔

یہ ہیں وہ سوالات جن پر اس وقت ہر شخص غور کر رہا ہے، لیکن کسی نتیجہ تک نہیں پہونچتا — لیکن حضرت نیاز کی اس تالیف میں آپ کو ان تمام باتوں کا جواب ملے گا اور ایسے تشفی بخش انداز میں کہ آپ کی یہ خلش و جستجو باقی نہ رہے گی۔

یہ تالیف تین حصوں میں منقسم ہوگی :- پہلے حصہ میں ۱۹۱۴ء کی جنگ کے اقتصادی و سیاسی نتائج سے بحث کی جائے گی کیونکہ یہی اصل بنیاد ہے دُنیا کے موجودہ اقتصادی بحران کی اور اس سلسلہ میں مشرق و مغرب کے ان تمام سیاسی، معاشرتی و سیاسی انقلابات سے بحث کی جائے گی، جو جنگ کی وجہ سے رونما ہوئے — دوسرے حصہ میں دُنیا کی موجودہ حالت پر تبصرہ کرکے بتایا جائے گا کہ ہوا کا رُخ کیا ہے اور تیسرے حصہ میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ اگر ارادہ خداوندی یہ نہیں ہے کہ کرۂ ارض کو ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا جائے تو آیندہ ساری دُنیا کو ایک ہی حکومت سے وابستہ ہونا ہے اور وہ حکومت سائنس و مادہ کی نہ ہوگی، دولت و صنعت کی نہ ہوگی بلکہ مذہب و اخلاق کی ہوگی، روحانیت و انسانیت کی ہوگی، اور یہ وہ وقت ہوگا جب کرۂ زمین پر انسان کم ہوگا، لیکن انسانیت زیادہ، یعنی وہ وقت جب یہاں صرف ایک حکومت ہوگی خدائی حکومت اور انسان مشینوں کی جگہ اسی کے سامنے سر جھکائے گا — یہ تالیف ایسی سادہ و سہل زبان میں ہوگی کہ معمولی پڑھا لکھا انسان بھی اسے سمجھ سکے — پھر

اگر آپ بیش بہا تالیف کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو "نگار" کی خریداری جاری رکھئے اور اس مقدس مقصد کی اشاعت کے لئے آیندہ جنوری ۱۹۵۵ء سے نگار کے جدید خریدار بھی پیدا کیجئے۔

اگر یہ تالیف علحدہ کتابی صورت میں شایع ہوتی تو ڈیڑھ ہزار صفحات سے کم نہ ہوتی اور اس کی قیمت آپکو پندرہ روپیہ ادا کرنا پڑتی، لیکن خریداری نگار کی صورت میں یہ کتاب آپ کو صرف دو روپیہ سالانہ ادا کرنے پر مل سکتی ہے۔

اس لئے جو حضرات اس ضمیمہ کو مستقلاً حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ از راہ کرم مطلع فرمادیں تاکہ ان کا نام آیندہ سالنامہ کا وی، پی چھ روپیہ پانچ آنہ کی جگہ آٹھ روپیہ پانچ آنہ میں روانہ کیا جائے، بصورت عدم اطلاع **سالنامہ** کا وی، پی (بغیر ضمیمہ کے) بدستور چھ روپیہ پانچ آنے میں بھیجا جائے گا۔

جن حضرات کا چندہ دسمبر ۴۹ء میں ختم نہیں ہوتا بلکہ ۵۰ء کے کسی مہینہ میں ختم ہوتا ہے وہ دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمادیں اگر یہ کتاب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ایجنٹ صاحبان کو سالنامہ ۵۰ء معہ اس ضمیمہ کے دو روپیہ چار آنے میں ملے گا اور بغیر ضمیمہ کے دو روپیہ میں (کمیشن ۲۵ فی صدی) سالنامہ کے بعد کے پرچے معہ ضمیمہ کے بارہ آنے میں اور بغیر ضمیمہ کے حسب دستور دس آنے میں ملیں گے (کمیشن ۲۵ فی صدی)

چونکہ اس کتاب کا ضمیمہ صرف اتنی ہی تعداد میں چھپے گا جتنا درکار ہوگا، اس لئے ایجنٹ صاحبان پہلے ہی سے مطلع کردیں کہ ان کو ضمیمہ والے اور بے ضمیمہ والی کتنی کاپیاں درکار ہیں۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

سالنامہ "نگار" ۵۰ء

اتنی عظیم الشان ادبی خدمت ہے، کہ اس کی اہمیت سے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ ذیل کی فہرست سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سالنامہ قدیم وجدید تنقید کا کتنا زبردست سنگم ہے اور ادبی معلومات میں جو اضافے آپ کو اس کے مطالعہ سے حاصل ہوسکتے ہیں، وہ کسی دوسری طرح میسر آہی نہیں سکتے۔

ذیل کی فہرست سے آپ کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے:-

فنِ تنقید ------ نیاز فتحپوری ------ کلام آسی ------ عارف ہسوی

کلام آزاد انصاری ------ اکبر حیدری ------ میر اور خارجی حالات کی ترجمانی ------ محی الدین قادری زور

اثر دہلوی ------ عبدالمنعم سیدی ------ میر شیر علی افسوس ------ سید محمد قادری

میر ممنون دہلوی کی شاعری ------ عبدالباری آسی ------ انعام اللہ خاں یقین ------ عرش فاروقی

صفیر بلگرامی ------ عبدالمالک آروی ------ لکھنؤ کی داستان گوئی ------ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

مدح یا ہجو ------ عندلیب شادانی ------ اردو غزل میں تصوف ------ فراق گورکھپوری

عزیز لکھنوی کی شاعری ------ فضل الدین اثر ------ مکاتیب رجب علی بیگ سرور وغیرہ وغیرہ ------ خواجہ احمد فاروقی

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازران کمپنی)

بحرِ احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے :-

عدن، پورٹ، سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان جہازوں کی آمدورفت باقاعدگی

اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت

دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶ - بنک اسٹریٹ بمبئی

مزید طاقت

• جن لوگوں کو زندگی کی دوڑ دھوپ میں نمایاں حصہ لینا پڑتا ہے۔ انھیں عام انسانوں سے زیادہ اپنی طاقت کو بحال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھی صحت مند غذا کے ساتھ ساتھ اگر وہ "شباب آور" کا استعمال بھی رکھیں۔ تو یہ نہ صرف ان کی کھوئی ہوئی طاقت کو بحال کریگا۔ بلکہ جسم میں نئی طاقت اور نئی اُمنگ بھی پیدا کریگا۔

شباب آور

نہ صرف ایک زبردست ٹانک ہے۔ بلکہ ایک بہترین خوراک بھی ہے۔ معدہ میں داخل ہوتے ہی مرطوب نڈھال اعضا میں جوانی کی نئی اُمنگ پیدا کرتا ہے۔ بلکہ دل و دماغ اور جگر کی کمزوریاں بھی مستقل طور پر اس سے دور ہو جاتی ہیں۔ قیمت پانچ روپے ؛

جوانی قائم رکھنے کے لئے رسالہ ہمدرد نوجوان اور ہمدرد شباب مفت طلب فرمائیں

ہمدرد دواخانہ ۔ دہلی

لوکل ایجنٹ ایجنسی ہمدرد دواخانہ امین آباد پارک لکھنؤ

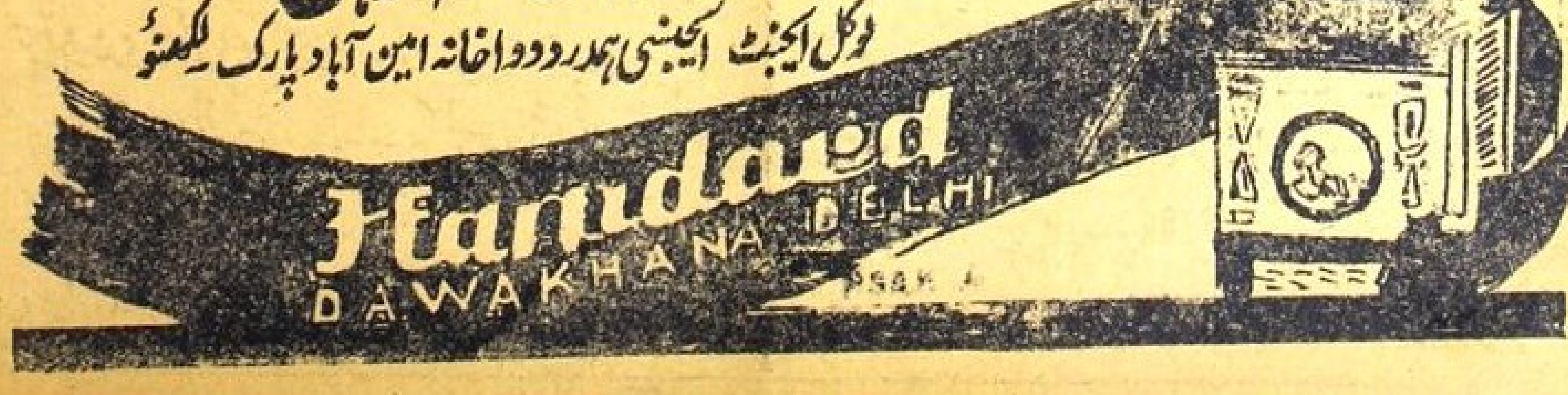

پاکستان کے خریدار اور ایجنٹ اسے پڑھ لیں

چونکہ فی الحال وی پی اور منی آرڈر کی روانگی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بند ہے اس لئے جن خریداروں کا چندہ ختم ہوگیا ہے ان کے نام نگار بدستور جاری رہے گا اور یہ پابندی دور ہونے کے بعد وی، پی روانہ کیا جائے گا۔ اس لئے جو حضرات خریداری کا سلسلہ جاری رکھنا نہیں چاہتے ہیں وہ ازراہِ کرم مطلع فرما دیں۔

ایجنٹوں کو بھی نگار پیڈ پیکٹ کی صورت میں روانہ ہوتا رہے گا اور یہ پابندی دور ہونے کے بعد پچھلے حساب کی رقم شامل کرکے وی، پی روانہ کیا جائے گا۔ اسی طرح کتابوں کے آرڈر محفوظ ہیں اور بعد تصفیہ اکسچینج ان کی تعمیل ہوگی۔

منیجر نگار

جلد (۵۶) — فہرست مضامین نومبر ۴۹ء — شمار (۵)

ملاحظات ---------- ۶
حالی --- خورشید الاسلام ---- ۹
صنعت و حرفت اور نفسیات --- خواجہ جلیل احمد ایم۔ اے -- ۱۷
ام-ان-رائے کی مشہور کتاب --- عبدالمالک آروی -- ۲۱
ترقی پسندی کا بکھرتا ہوا شیرازہ --- علی جواد زیدی -- ۲۷
ہندوستانی گیت --- بسم اللہ بیگم -- ۳۷
دُنیا کا مستقبل ------- ۴۲
آٹم بم کے متعلق کچھ جدید معلومات ------- ۴۷
تاریخ طبیعی کا ایک ورق ------- ۴۹
ایک اکسیر جدید ------- ۵۰
ماله وماعلیہ ------- ۵۱
ابر و باد (نظم) --- پروفیسر شور --- ۵۴
طوفان (نظم) --- افسر سیمابی احمد نگری --- ۵۵
غزل --- درد سعیدی و عرشی بھوپالی --- ۵۶
مرثیہ نگاری اور میر انیس --- ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ۵۷/۹۹ ۹۳/۹۶

افسوس ہے کہ مشین کا موٹر خراب ہو جانے کی وجہ سے اس مہینہ کا پرچہ ایک ہفتہ لیٹ شایع ہو رہا ہے

ملاحظات

ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ ذہنیت

"سیاست" نہ کوئی ریاضی کا مسلمہ مسئلہ ہے جس میں تبدیلی نہ ہو سکے اور نہ کوئی طبیعی حقیقت ہے کہ اس میں تغیر و تبدل کی گنجایش نہ ہو۔

سیاست فن ہے زمانہ کی نبض شناسی کا، ماحول اور حالات کے ساتھ ہم آہنگی کا اور مستقبل کو سامنے رکھ کر حال میں تبدیلی پیدا کرنے کا۔ خواہ حکومت شخصی ہو، جماعتی ہو یا جمہوری۔ فرق یہ ہے کہ شخصی حکومت کا نقطۂ نظر بہت تنگ ہوتا ہے اور حکمراں کی ذات یا اس کے خاندان کے مفاد سے آگے نہیں بڑھتا ہے۔ جماعتی حکومت میں یہ تنگ نظری نسبتاً کم ہو جاتی ہے، لیکن نہ اتنی کم کہ "اقلیت" اس سے متاثر نہ ہو، جمہوری حکومت میں البتہ اصولاً زیادہ مساوات ہونا چاہئے، لیکن صحیح معنے میں جمہوریت اس وقت ہے کہاں؟ جماعتی سیاست ہی برسر اقتدار رہتی ہے اور اکثریت ہی کا بول بالا رہتا ہے۔

دوسرے ملکوں میں چونکہ قوم و مذہب کے اختلاف کا کوئی سوال نہیں ہے، اس لئے وہاں کی سیاسی جماعتوں کا اختلاف صرف سیاست تک محدود رہتا ہے، لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں قومیت و مذہبیت، رنگ و نسل، کلچر و زبان کے اختلافات بھی ملکی سیاست پر اثر ڈالتے ہیں، اس لئے یہاں کی کانگرسی جماعت کا اقتدار صرف کانگرس کا اقتدار نہیں بلکہ ہندو مذہب کا اقتدار سمجھا جاتا ہے، جو اصولاً صحیح نہیں۔

کانگرس یقیناً خالص سیاسی جماعت ہے اور اس میں شامل ہونے کے لئے ہر شخص آزاد ہے، لیکن چونکہ اس میں اکثریت ہندوؤں کی ہے، اس لئے مسلمانوں کو یہ سمجھنے کا موقعہ ملتا ہے کہ کانگرس سیاسی نہیں بلکہ مذہبی جماعت ہے۔ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بعد جو حالات رونما ہوئے اور صوبوں کی حکومتوں اور وہاں کے عمال نے (باوجود اس کے کہ حکومت کے غیر مذہبی ہونے کا اعلان کر دیا گیا تھا) جس تنگ نظری سے کام لیا، اس نے اور زیادہ بدظنی پیدا کر دی، چنانچہ اس وقت ہندوستان کے اکثر مسلمان نہایت بے اطمینانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور سب سے بڑی فکر ان کو یہ ہے کہ ان کی آیندہ نسل کا یہاں کیا حشر ہوگا — ان کی یہ فکر بالکل حق بجانب ہے، لیکن اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اس کا علاج کیا ہے۔ اگر اسے انفرادی حیثیت سے غور کیا جائے تو اس کا نہایت آسان اور کھلا ہوا علاج یہ ہے کہ ایسے مسلمان جو ہندوستانی حکومت سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں، وہ پاکستان چلے جائیں، لیکن چونکہ یہ مسئلہ ہزار دو ہزار کا نہیں، لاکھ دو لاکھ کا نہیں بلکہ کروڑوں مسلمانوں کا ہے جو ہندوستان میں سکونت رکھنے پر مجبور ہیں، اس لئے ہم کو اصولاً اجتماعی نقطۂ نظر ہی سے اس پر غور کرنا چاہئے — یہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور اب پھر اس کا اظہار کرتے ہیں کہ جس طرح کسی ملک کی رعایا حکومت کو بدظن کر کے

چین سے نہیں رہ سکتی، اسی طرح دنیا کی کوئی حکومت اپنی رعایا میں سکون و اطمینان کا احساس پیدا کئے بغیر عرصہ تک قایم نہیں رہ سکتی - بدقسمتی سے ہندوستان اس وقت جس دور سے گزر رہا ہے وہ اسی شک و بدگمانی کا دور ہے، یعنی ایک طرف حکومت مسلمانوں کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور دوسری طرف مسلمان یہ سمجھ رہے ہیں کہ حکومت انھیں قصداً پامال کرنا چاہتی ہے - میں سمجھتا ہوں کہ دونوں اپنی جگہ حق بجانب ہیں، لیکن میں اس کا قایل نہیں کہ اس حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں اس کا ذمہ دار زیادہ تر مسلمانوں ہی کو قرار دوں گا۔

مسلمانوں کا یہ کیرکٹر ہے کہ وہ بہت جلد مشتعل ہو جاتے ہیں اور وقتی جوش کی حالت میں وہ سب کچھ کر سکتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان میں سوجھ بوجھ، استقلال و استقامت اور صبر و ضبط کا مادہ کم ہے - جلد مشتعل ہو جانے والی قوم، جلد گھبرا بھی جاتی ہے اور بجائے اس کے کہ وہ کسی عزم پر پختگی کے ساتھ ڈٹ جائے، جلد مایوس بھی ہو جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر مسلمان یہاں رہنا چاہتے ہیں تو اولین شرط یہ ہے کہ وہ حکومت کے وفادار رہیں لیکن وفاداری کا مفہوم مسلمانوں نے بہت غلط سمجھا ہے - وفاداری کے معنی صرف یہ ہیں کہ حکومت کے ساتھ غداری نہ کی جائے اور اس کے بنائے ہوئے قانون کا احترام کیا جائے - لیکن اس لئے نہیں کہ ہم اس پر مجبور ہیں بلکہ یہ سمجھ کر کہ یہ ہمارا تمدنی و انسانی فرض ہے - وفاداری کے معنے ذہنی شکست خوردگی یا بزدلی کے نہیں ہیں -

حکومتِ ہندوستان نے اعلان کیا ہے کہ وہ ایک غیر مذہبی جمہوری حکومت ہے، یعنی اس میں ہر جماعت کو ترقی کی آزادی حاصل ہے اور وہ پوری قوت کے ساتھ اپنے حقوق کے لئے احتجاج کر سکتی ہے - اس لئے اگر مسلمانوں کو حکومت کے عمال یا خود حکومت کے کسی طرز عمل سے جایز شکایت کا موقعہ ملتا ہے تو اس پر خاموش رہنا وفاداری نہیں، بلکہ بزدلی ہے اور مایوس ہو کر ہاتھ پاؤں ڈال دینا حد درجہ خطرناک بات ہے - افسوس ہے کہ اس ذہنیت کا اظہار سب سے پہلے اس جماعت کی طرف سے ہوا جو پاکستان حاصل کرنے کے لئے تو جان دینے کے لئے طیار تھی، لیکن ہندوستان میں رہنے کے لئے پائے استقامت اس کے پاس نہ تھی - حالانکہ پاکستان تو بغیر جان دئے انھیں مل گیا اور جب یہاں رہنے کے لئے جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہوئی تو کوئی سامنے نہیں آتا اور اس نے وفاداری کا مفہوم ذلت کی زندگی بسر کرنا قرار دے لیا ہے - اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ ذہنیت حد درجہ افسوس ناک ہے اور جس بری طرح وہ ہمت چھوڑ بیٹھے ہیں اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ حکومت ان کو مٹائے یا نہ مٹائے وہ خود اپنے آپ کو مٹائے بغیر نہ رہیں گے -

اس وقت یہ عالم ہے کہ حکومت اگر ذبیحہ گاؤ بند کرتی ہے تو مسلمان سمجھتے ہیں کہ اُن کا مذہب ختم ہو گیا، ہندی زبان رائج ہوتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں اُردو مٹ گئی، نوکریوں کے دروازے ان پر بند ہوتے ہیں تو ان کے نزدیک زندگی کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں - لیکن یہ احساس ان میں کوئی روح عمل پیدا نہیں کرتا، بلکہ انھیں مایوسی کی طرف لیجاتا ہے اور اپنے

مستقبل میں تاریکی کے سوا انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔

پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان پہونچنے کے سوا، اور کوئی صورت مفر کی نظر نہیں آتی تو ان کی یہ ذہنیت پاکستان ہی کو کیا فایدہ پہونچا سکتی ہے اور پاکستان ان کے لئے کیا کر سکتا ہے۔ ایسی قوم جہاں کہیں جائے گی وہ ملک وحکومت پر بار ہو گی اور ایسے کروروں ناکارہ انسانوں کا بار ایسی معمولی بات نہیں جسے دُنیا کی کوئی حکومت برداشت کر سکے۔ پاکستان اس وقت تک پناہ گزینوں کے مسئلہ کو طے نہیں کر سکا اور اس کے بجٹ پر اتنا بار پڑ گیا ہے کہ بہت سی اصطلاحی اسکیموں کو اسے ملتوی کرنا پڑا۔ اس لئے پاکستان کی دوستی کا اقتضار بھی اسکی اجازت نہیں دیتا کہ یہاں کے مسلمان ہجرت کر کے وہاں جائیں اور اس کی مشکلات میں اضافہ کریں۔

ان حالات میں نجات کی تنہا صورت صرف یہی ہے کہ مسلمانوں کو سب سے پہلے تو یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ وہ یہیں رہیں گے اور پھر اپنی شکست خوردہ ذہنیت کو دور کر کے یہ عزم کر لینا چاہئے کہ اپنی خودداری کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیں گے۔

ہندوستان کی حکومت اپنے آپ کو غیر مذہبی حکومت کہتی ہے اور اسی اعلان کی روشنی میں ہمیں اپنے سارے مطالبات اس کے سامنے پیش کرنا چاہئے، جس کی بہترین صورت یہ ہے کہ سیاسی حیثیت سے ہم کانگرس کا ساتھ دیں اور اپنے تمدنی، اخلاقی و مذہبی مسایل جمعیتہ العلمار کے سپرد کر دیں۔

"تنقیدی اشارے" کا تازہ اڈیشن

پروفیسر آلِ احمد سرور۔ ریڈر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کے اُنیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ پروفیسر سرور اس عہد کے صفِ اول کے نقادوں میں سے ہیں اور انکے تنقیدی مقالات سندی حیثیت رکھتے ہیں۔ مقالات کی فہرست یہ ہے:-

اُردو ناول کا ارتقا — اُردو میں فسانہ نگاری — اُردو میں خمریات — خطوط میں شخصیت — انگریزی شاعری — ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ — اکبر شخصیت اور آرٹ — چکبست لکھنوی — اقبال اور ان کا فلسفہ — فانی بدایونی — رتن ناتھ سرشار — ہندوستانی ادب میں آغا حشر کا درجہ — سرسید کے خطوط — مکاتیب مہدی — خنداں — جدید اُردو تنقید — حیات شبلی — مجھے کون کون سی کہانیاں پسند ہیں۔

اس اڈیشن میں پچھلے اڈیشنوں سے کافی اضافہ کیا گیا ہے۔ ۲۰۲ صفحات۔ کاغذ ۲۸ پونڈ۔ مجلد مع رنگین گرد پوش۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول　　　منیجر نگار۔ لکھنؤ

حالی

(خطوط کی روشنی میں)

حالی کوئی بڑے فن کار نہیں تھے۔ انھوں نے زندگی کو از اول تا آخر قبول نہیں کیا۔ وہ روحانیت کی اس منزل تک نہ پہونچ سکے جہاں تضاد آہنگ سے اور کشمکش آسودگی سے بدل جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف انھوں نے اپنی خودی کو، داغ اور مومن کی طرح گوشت پوست کے سپرد بھی نہیں کیا۔ سجاد انصاری کا یہ قول ایک حد تک صائب ہے۔ "کہ میں اُس حالی کا قائل ہوں جس نے مقدمہ سے پہلے شاعری کی اور شاعری کے بعد مقدمہ لکھا" لیکن یہ اُس حالی کی توہین بھی ہے، جس کے نزدیک مسکرانا خدا اور انسان دونوں کی توہین تھا۔ حالی روایتی غزل کے میدان میں جولانیاں دکھا سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے شعور کے ایک حصہ سے کام لیکر چند اچھی غزلیں یادگار چھوڑیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آیا حالی نے غزل گوئی کو خیرباد کہکر، اپنے آپ سے وفا کی یا نہیں۔ اُن کے نزدیک روایت اور صداقت میں کوئی فرق تھا یا نہیں۔ صداقت ان کے ذہن میں ایک مجرد تصور کی حیثیت رکھتی تھی یا اُسے پانے کے لئے انسانوں کے ہجوم میں کھو جانا ضروری تھا۔

غالب نے اُنھیں مشورہ دیا تھا کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے، لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں زندگی کی بے مائگی کے احساس نے، اُنھیں حواس کی لذت سے بیگانہ کر دیا، شیفتہ نے جو عریوں کا مزاج لیکر پیدا ہوئے تھے، انھیں صداقت کی تلقین کی جس کی بدولت وہ زندگی کے نئے ساز و سامان اور سرسید کی رہنمائی کی طرف رجوع ہوئے۔ ان تین منزلوں سے گزرنے کے بعد وہ اُس حقیقت تک پہونچے، جسے ہم حالی کہتے ہیں۔ حالی نے اپنے آپ سے وفا کی اور اسی لئے وہ اب تک زندہ ہیں۔

اُن کے مکاتیب قہقہوں سے خالی ہیں۔ غدر، حالی کے لئے ایک ایسا نفسیاتی سانحہ تھا جس نے اُن کی ساری زندگی کو خوشی سے محروم کر دیا۔ اُن کے لبوں پر کبھی کبھی ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے، لیکن اُس مسکراہٹ میں صرف افسردگی ہی نہیں ملتی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ پر طنز کر رہے ہیں یا دل کی ٹیس ہے جو مسکراہٹ میں تبدیل ہوگئی ہے۔ حالی کے کارنامے خونِ چمن ہیں لیکن اُن میں چمن کی رنگینی اور خون کی گرمی نام کو نہیں۔ ان کے مکاتیب اُن لمحوں کی یادگار معلوم ہوتے ہیں جو شغل گریہ سے محروم رہ گئے۔ ان میں زندگی، حسن اور توانائی کے آثار ناپید ہیں، اُن کے خطوط کاروباری ہیں۔ رونے سے فارغ ہوکر اُنھیں روز کی زندگی کے فریضے یاد آتے ہیں۔ اور وہ چار و ناچار، افسوسناک بے تعلقی کے ساتھ خط لکھنے پر مجبور

ہو جاتے ہیں - انھیں مکتوب الیہ بے جان معلوم ہوتا ہے - وہ خط لکھنے میں سلیقہ کا ثبوت نہیں دیتے بلکہ اپنی خانگی زندگی میں سلیقہ کا ثبوت دینے کے لئے خط لکھتے ہیں - مہدی کی لذت پرستی اور معتدل ہیجان تو اُن کے خواب و خیال سے باہر تھے - حیرت اس پر ہے کہ وہ شبلی کے حُسنِ الفاظ کو بھی گناہ سمجھتے ہیں - ایسا کیوں ہے ؟

اِس کا ایک سبب، تو یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے انحطاط سے ضرورت سے زیادہ متاثر تھے لیکن اس سے زیادہ اہم سبب اُن کا اپنا نقطۂ نظر ہے - مکاتیب کی روشنی میں، اُن کے چند نفسیاتی پہلو، بہت نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں - حالی زندہ تو رہتے ہیں مگر زندگی سے حظ اُٹھانا، اُن کی شریعت میں ممنوع ہے - اُن کے نزدیک، زندگی فرائض کے تسلسل کا نام ہے - شادی سے پہلے، عورت پر اپنی عصمت کو محفوظ رکھنا فرض ہے - شادی کے بعد، خاوند کی اطاعت اور بچّوں کی تربیت، یہ دو آیات بینات ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے - فرد کو جماعت کی امنگوں اور آنسوؤں کا ساتھ دینا چاہئے - اپنے ہمسایوں کی تیمارداری میں جہاں تک ہو سکے ایثار کرنا چاہئے - راستے میں کانٹے نظر آئیں تو انھیں دوسروں کے آرام کے خیال سے ہٹا دینا ثواب ہے - بازار میں اس طور پر چلنا چاہئے کہ نظریں نیچی رہیں اور اگر پھر بھی نگاہوں کے سامنے بجلی سی چمک جائے تو استغفار عین بندگی ہو - چاندنی راتیں محض اس لئے ہیں کہ اُن میں قضائے عمری ادا کی جائے -

حالی کی شریعت، طریقت، زندگی اور ذہن، نیکیوں کی خوفناک سازش ہیں، یہ نیکیاں مستی سے تہی اور سرشاری سے محروم ہیں - اُن کی بنیاد چند اُصولوں پر ہے جنھیں کاروبار کی نوعیت اور معاملات کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے - یہ وہ نیکیاں نہیں ہیں جو خون سے از خود اُبلتی ہیں جن میں نہ ارادے کو دخل ہوتا ہے، نہ انعام کی خواہش ہوتی ہے، نہ برکتوں کا احساس ہوتا ہے ایسی نیکیوں تک پہونچنے کے لئے روحانی عذاب میں مبتلا رہنا ضروری ہے - لغزشوں کا سرمایہ اور لذتوں کا خمار ہی نہیں، اُن کے لئے وہ گمرہی بھی درکار ہے جو خضر و مسیح سے فارغ ہوتی ہے - وہ نیکیاں جو نجات کا وسیلہ ہوں اور کی جائیں اور وہ نیکیاں جو لذت کا ذریعہ ہوں اور ہو جائیں اُن میں بہت بڑا فرق ہے اگر آپ حالی کی مانند، نجات کے وسیلوں پر ایمان لے آئیں تو زندگی بیکراں نہیں رہتی اور تشکر کا وہ احساس جو روحانیت کی جان ہے فنا ہو جاتا ہے - اس پہلو کو واجبی اہمیت دینے کے بعد، ہم آسانی سے اُن کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر تبصرہ کر سکتے ہیں، حُسن اور حُسن کے احساس سے محرومی - ایک قسم کا کاروباری میلان، روزانہ معاملات میں چند بے جان اصول کی کارفرمائی، نیکیوں کا محدود تصور، اُن کا بے رنگ، سپاٹ اور بے مزہ اسلوب، ظرافت کی افسوسناک حد تک کمی - رجائیت اور توانائی کا فقدان اور ان کے شعری کارناموں کی یکسانیت اُن کا خاموش ایثار ضرورت سے زیادہ انکسار اور ذہنی توازن، یہ ساری خوبیاں اور خامیاں، زندگی کے اُس نقطۂ نظر سے پیدا ہوتی ہیں جس میں روایت کا لہو ہے لیکن جس میں ساتھ ساتھ زندگی سے ایک حد تک نباہ کرنے کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے -

شبلی کے خطوط میں، قومی شعور کے گہرے سائے، ادبی دلچسپیاں، کتابوں پر تبصرے، کشمیر کی فضائیں، جذبات کی برانگیختگی، عورتوں کا حُسن، موسیقی اور مصوری کیا نہیں ہے - خزاں اُن کے ہاتھوں میں جا کر بہار بنجاتی ہے - ان کے

خطوں میں پندارے چشمکیں ہیں، لطیف اشارے ہیں۔ کہیں پردے گرتے ہیں اور کہیں اُٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حالی کے مکاتیب اِن لطایف سے محروم ہیں۔ چند مکاتیب میں نئی تعلیم اور علی گڑھ کے بعض وقتی مسایل پر تبصرہ ہے لیکن اُن کے بیشتر خطوط میں خانگی معاملات اور نجی ضرورتوں کا بیان ملتا ہے، کہیں کہیں ایک دو ہمعصروں کا تذکرہ بھی ہے، لیکن اِس طور پر جیسے کسی سے راستہ میں سلام دُعا ہو جائے۔ اس کے باوجود اُن کی شخصیت اُن خطوط میں نمایاں ہے۔ نئی تعلیم اور علی گڑھ کے متعلق چند باتیں بصیرت سے خالی نہیں۔ حبیب الرحمن خاں شیروانی کو لکھتے ہیں۔

"میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ انگلش لٹریچر سے واقف نہ ہوئے ہوتے تو اس تصنیف کا خیال ہرگز آپ کے دل میں نہ گزرتا پس تا وقتیکہ ندوۃ العلماء انگریزی تعلیم کی ضرورت پر زور نہ دے گی۔ اس کی چیخ پکار سے کوئی معتد بہ نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا اسی کے ساتھ میرا یہ بھی خیال ہے کہ صرف انگریزی تعلیم، جب تک کہ اس میں مشرقی تعلیم کی چاشنی نہ دی جائے گی، ہرگز مفید آدمی پیدا نہیں کر سکتی۔ مجھے ایک انگریزی تعلیم یافتہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جو مسلمان علماء کے حالات پر ایک ویسی کتاب لکھ دے جیسی کہ آپ نے لکھی ہے"

حالی کی اس رائے میں توازن ہے۔ حالی کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔ اِن الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی خدا کو حاضر و ناظر جان کر اپنے دل کی بات ایک رازدار پر ظاہر کر رہے ہیں وہ ندوۃ العلماء کی ضرورت پر شبلی سے زیادہ یقین رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں یہ اور بات ہے، لیکن وہ مسلمانوں کو جگانے اور جلانے کے لئے مشرق اور مغرب میں ملاپ چاہتے ہیں۔ اُن کے دل میں محض اس کی تمنا ہی نہیں ہے بلکہ اُن کے دماغ میں اس کا ایک تصور بھی موجود ہے۔ وہ علی گڑھ تحریک سے متعلق تھے لیکن، علی گڑھ میں اُن کے تصور کا خفیف سا عکس ملتا تھا اور بس۔ اس کے باوجود وہ اپنی ساری زندگی علیگڈھ سے متعلق رہے اور سرسید کی ہر بات کو حدیث اور آیت سمجھتے رہے۔ شبلی اسی لئے اُن سے برہم تھے اور ان کے متعلق وہی رائے رکھتے تھے جو کسی محترم خاتون کے متعلق قایم کی جا سکتی ہے۔ شبلی کو اس بات پر تعجب تھا کہ سرسید اور حالی اسلامی روایتوں اور مشرقی علوم کا پاس کرتے ہیں اور انھیں بھی یہ سرمایہ میری ہی طرح عزیز ہے مگر اسکے باوجود خدا نے اُن کے دلوں پر ایسی مہر لگا دی ہے کہ وہ علی گڈھ کو مسلمانوں کی آرزوؤں کا آئینہ سمجھتے ہیں، درانحالیکہ اُن کے حوصلوں کو شیشے میں اُتارئے تو دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے، لیکن ـــــ حالی افق کو پڑھ سکتے تھے اور وہ "صراط مستقیم" پر چلتے رہے۔ اُن میں نہ تو شبلی کی سی جرأت رندانہ تھی، نہ قوتِ عمل، اُن کے شعور میں وہ تیزی بھی نہیں تھی۔ وہ شاید عمل جراحت سے گھبراتے تھے۔ اسی لئے وہ باوجود صفائے قلب، شبلی کے زاویۂ نظر کے قایل نہ ہو سکے۔ خدا کے دونوں قایل تھے، اسلام پر دونوں ایمان رکھتے تھے، قومی احساس دونوں میں تھا۔ نئی اور پرانی قدروں میں آہنگ پیدا کرنے کی خواہش دونوں کو تھی۔ مادی ضروریات سے نہ وہ بیگانہ تھے اور نہ انھیں ہی ایسا گریز تھا۔ فرق کہاں ہے؟ حالی چند نیکیوں کے قایل تھے وہ مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کے بعد اپنی اور دوسروں کی مغفرت کی دعا مانگتے تھے اور مسجد سے باہر آکر، تجارت کے اصول

پر غور کرتے تھے - اپنے فایدہ کے لئے نہیں روایتی قوم کے فایدہ کے لئے انھیں اپنے ماضی سے محبت تھی لیکن حال اُنکے لئے زندہ تھا - ممکن ہے شبلی کو اُن کی بصیرت خام نظر آتی ہو - لیکن سرسید اور حالی کو، اپنی بصیرت اور بصارت دونوں پر اعتماد تھا - حالی تجربہ کو منطق پر ترجیح دیتے تھے اور اسی لئے اُنھوں نے بدلتی ہوئی دنیا کے، جذبوں کو سراہا اور اُن کا ساتھ دیا -

حالی، اس خوبی سے یقیناً محروم ہیں، جو شبلی میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور شبلی ہی پر کیا منحصر ہے پوری جرمن قوم میں پائی جاتی ہے جسے انگریزی محاورہ میں going The whole hog کہتے ہیں - شبلی ایمان لانے کے لئے خدا کے وجود کو چون و چرا سے ثابت کرتے ہیں اس کے بعد ہر نظام کی جزئیات کو لاشعاعوں سے دیکھتے ہیں اور پھر خالص منطق کے اصول پر علم و مذہب کی تعمیر کرتے ہیں - یہاں حالی کے اس پہلو پر پھر ایک بار نظر ڈالئے - جسے ہم اب تک اُن کی خامی سمجھتے رہے ہیں - حالی چند روایتی نیکیوں کے قایل تھے (میں نے اس بات پر نیک نیتی سے زور دیا ہے - میں ایک فن کار کے لئے عالم سفلی اور عالم علوی، دونوں کی سیر ضروری سمجھتا ہوں - زندگی کو سرشار کرنے کے لئے اور سرشار زندگی گزارنے کے لئے، آگ ا دونوں سے کھیلنا چاہئے، خدا نے، خلا سے زندگی پیدا کی - کشمکش میں آسودگی پیدا کرنا ہمارا کام ہے یہ آہنگ، یہ توازن اور یہ آسودگی سچے علم کے بغیر ممکن نہیں اور سچا علم گناہ اور ثواب دونوں کا علم ہے) - حالی بحیثیت فنکار کے، اس لئے ناقص ہیں کہ اُن میں وہ آفاقیت نہیں ہے جو سچے علم سے پیدا ہوتی ہے، اُن کے آئینہ میں ہزار رنگ نہیں ملتے اور یہی سبب ہے کہ ہر شخص کے اعصاب ان کی شاعری سے تسکین نہیں پاتے، لیکن حالی کی شخصیت کا یہی پہلو اُنھیں شبلی کی غلطیوں سے باز رکھتا ہے - یہ نہ سمجھئے کہ شبلی میں وہ خوبیاں مل جاتی ہیں جو شاعر حالی میں نہیں ملتیں - بہرحال، حالی، چند انسانی نیکیوں پر عمل کرتے ہیں اور اس کے بعد زندگی اور زمانے کا ساتھ دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں وہ اپنی خانگی زندگی میں بھلائیاں کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اُن کی ترغیب دیتے ہیں لیکن منطق کے اصول پر مذہبی اور معاشرتی نظام کی بنیاد رکھنے میں انھیں کوئی خاص دلچسپی محسوس نہیں ہوتی - مذہب کے بارے میں اُن کی رائے وہی ہے جو دنیا کے اکثر معقول لوگوں کی ہے - یہ اور بات ہے کہ معقول لوگ مذہب اور عورت کے باب میں اکثر اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے - اس روشنی میں دیکھئے تو حالی کا زاویۂ نظر خلوص پر مبنی ہے اور اُن کی نیکیاں صرف ان معنوں میں روایتی ہیں کہ اُنھیں بزرگوں کے ورثہ کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا ہے، پھر بھی یہ نیکیاں خالص انسانی نیکیاں ہیں جو کسی نظام کی پابند نہیں ہیں اور جن پر عمل کرنے کے لئے آسمان اور زمین کی ماہیت دریافت کرنا ضروری ہے نہ مستحسن -

اپنے صاحبزادے کو لکھتے ہیں " میں تو فرائض کے بعد کوئی عبادت اور کوئی بھلائی اس کے برابر نہیں سمجھتا کہ اوّلاً اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ اور پھر تمام ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو بھلائی کی جائے " ان چند فقروں میں حالی نے خود اپنے چند پہلوؤں کو روشن کر دیا ہے - فرائض کا تصور انھیں بزرگوں سے ملا ہے اور اس تصور کے علاوہ اُنکے لئے کوئی چارۂ کار بھی نہیں ہے - وہ ایک جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ تعلق محض تعلق نہیں ہے - تعلق خاطر ہے، یہ

فرایض اُن کی زندگی کو سنوارتے ہیں۔ اُن سے زندگی کا احترام پیدا ہوتا ہے، یہ احترام کوئی جامد شے نہیں ہے۔ اس کی لہریں پھیلتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے دائرے بناتی ہوئی ایک بڑے دائرے میں کھو جاتی ہیں۔ اگر ہم ان جلووں پر ذرا اور فکر کریں تو ہمیں ان کے شعری کارناموں اور اُن کی شخصیت میں جو ربط ہے وہ بھی آسانی سے معلوم ہو جائے گا۔ مسدس انکی سب سے بڑی نیکی ہے۔ اگر وہ مسدس نہ لکھتے تو اپنے نفس کو فریب دیتے، وہ اس کے علاوہ، کچھ اور لکھ بھی نہیں سکتے تھے۔

مسدس ایک مرثیہ ہے، لیکن اُس میں جو ضبط پایا جاتا ہے وہ تعمیری ہے۔ اُس میں داخلی فضائیت ہے اور پر سکون چاندنی ہے البتہ اس میں نہ تو وہ حسین دیوانگی ہے جو لاشعور کی موسیقی سے پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ گہرا شعور ہے جو علم سے پیدا ہوتا ہے لہجہ کہیں کہیں بدلتا ہے لیکن بحر کہیں نہیں بدلتی۔ کافی طویل نظم ہے لیکن دھیمے جذبوں کی گرمی قایم رہتی ہے۔ نظم کا دامن محدود ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان جو فاصلہ ہے مسدس کا موضوع اُس پر حاوی نہیں، لیکن اس کی زبان عوام کی زبان ہے۔

میر کے بعد صرف حالی نے انسانوں کی زبان استعمال کی ہے۔ حالی نے روایتی شاعری سے بغاوت کی ہے لیکن بحریں اور پیمانے جوں کے توں قایم رکھے ہیں۔ یہ بحریں اور پیمانے، اُنھیں بزرگوں سے ملے تھے اور چونکہ اُن کے مزاج میں ایک حد تک روایتوں کی خو بو تھی۔ اس لیے جس طرح انھوں نے چند فرایض کو اپنی زندگی میں قبول کر لیا تھا اسی طرح انھوں نے پرانے اسالیب کو اپنی شاعری میں جگہ دی البتہ شاعری کا محور بدل دیا۔ مومن، اُردو شاعری میں انقلاب پیدا کر سکتے تھے، اُنھیں اپنے ماحول سے دلچسپی تھی۔ ان کے خوابوں میں، شاہد اور شراب کے علاوہ، زندگی کی نئی کروٹیں بھی تھیں لیکن ان کا بہتر نفس اُن رنگینیوں سے سرشار ہو چکا تھا جنھیں دیکھ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں اور چکھ سکتے ہیں۔ حالی کا بہتر نفس، مومن کے بہتر نفس کا جواب تھا۔ انگریزی محاورہ کے مطابق، قربان گاہ کی آگ نے اُن کے ہونٹوں کو چھو لیا تھا۔ لیکن ایسا کیوں ہے، کہ اس ذہنی انقلاب کے باوجود، حالی نے "خون آدم" کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ فرایض کے بعد وہ "اوّلاً عزیزوں اور دوستوں اور پھر تمام ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو" بھلائی کرنے کے قایل تھے۔ حالی مسلمان پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے زندگی کی جو تصویریں دیکھی تھیں اُن میں سب سے زیادہ حسین اور آشنا تصویر مسلمانوں کی تھی۔ اور پھر ان کی زندگی میں ایک ساعت وہ آئی، جب انھوں نے دیکھا کہ وہ حسین اور آشنا تصویر اپنے لہو میں ڈوب گئی۔ حالی، اپنے آنا کو انسانوں کے سپرد کر چکے تھے۔ وہ خالص انسانی شاعر ہوتے لیکن اس سانحہ نے اُنھیں صرف قومی شاعر بنا دیا۔ یہ بھلائی کرنے کی خواہش انھیں اُس غار سے نکال کر جہاں پرچھائیاں ہی پرچھائیاں تھیں، دوپہر کی دھوپ میں لے آئی اور اس خواہش کی بدولت، وہ دُنیا کے تماشوں سے دور ہو گئے۔ ان کا موضوعِ شاعری محدود ہو گیا۔ ناکردہ گناہوں کی حسرت نہ اُنکے دل میں پیدا ہوئی اور نہ انھوں نے کسی سے اس کی داد چاہی۔ حالی اپنے کارناموں میں تیماردار کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ بیماروں سے اُنھی کی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ اپنے جذبہ کی شدت کو ظاہر نہیں کرتے۔ انتہائی ضبط و سکون سے کام لیتے ہیں۔ اُن کے لاشعور کی پہنائیاں یا تو سو گئی ہیں یا انھیں تھپک تھپک کر سلا دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسدس پر عقل حاوی ہے اور اسلوب کیف سے

نظم پھر بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گی کیونکہ حالی نے اپنے بہتر نفس اور انسانوں سے وفا کی۔

حالی کی شخصیت میں وہ بات تھی جو سچی چاندی میں ہوتی ہے۔ اُس میں اگر کوئی ملاوٹ ہوگی تو اُسے غالب کی رچی ہوئی زندگی، شیفتہ کی سادگی اور غدر کے سانحہ نے تپا کر صاف کر دیا تھا۔ زندگی میں انھیں وہ عیش کبھی حاصل نہیں ہوا جس سے نفس بیدار ہوتا ہے اور نفسانیت پرورش پاتی ہے۔ اُنھیں انسانوں اور شہروں سے محبت تھی اور اُن کے سینہ میں چند اچھے لمحوں کی یادیں تھیں جن کا رس پی کر انھوں نے یادگار غالب لکھی۔ دلّی سے اُنھیں کتنی محبت تھی، شیفتہ سے اُنھیں کتنا خلوص تھا۔ یہ حالی کا خلوص ہی تھا جس کی بدولت وہ اس دور کے سامری غالب کے مقابلہ میں شیفتہ سے زیادہ متاثر ہوئے اور یہ بھی اُن کا خلوص ہی تھا کہ انھوں نے اُس دور کے سامری کو عوام سے روشناس کرایا، لیکن اس خلوص کے باوجود، یادگار غالب اور حیات جاوید، اچھی سوانح عمریاں ہیں۔ یادگار غالب تنقیدی جائزہ ہے اور حیات جاوید معاشرتی جائزہ ہے یہاں میں پھر حالی کی بنیادی خوبی اور خامی پر زور دوں گا۔ اگر حالی کے ذہن میں نیکیوں کا ایک خاص تصور نہ ہوتا تو یہ تصویریں زندہ اور بھرپور ہوتیں۔ حالی انسان کو مجمع میں دیکھتے ہیں اور دکھاتے ہیں۔ رات کی تنہائیوں میں، بے تکلف دوستوں میں اور شہر کے تنگ کوچوں میں نہ وہ خود کہیں نظر آتے ہیں اور نہ دوسروں کا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ انسانوں سے محبت کرنے کے باوجود انسانوں سے محبت نہیں کرتے۔ حالی اگر کسی عورت کی سوانح عمری لکھتے تو وہ حضرت مریم ہوتیں۔ قرۃ العین نہ ہوتی شاید حالی کے دماغ میں روح و بدن کا وہ تصور تھا جو بدن کے مظاہر کو روح کے مظاہر سے بے تعلق سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی ہر سوانح عمری، دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک مختصر دوسرا طویل۔ پہلے حصہ میں زمین ہموار کی جاتی ہے اور دوسرے میں آپ حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُنھیں "ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں" سے دلچسپی ہے۔ عورتوں سے نہیں۔ مائیں، بہنیں اور بیٹیاں بھی عورتیں ہوتی ہیں لیکن ہم اُنھیں ساتویں آسمان کی مخلوق سمجھتے ہیں۔ یہ ایک ایسی فاش غلطی ہے جس سے ہماری معاشرت میں ریاکاری اخلاق کا جزو بن گئی ہے۔ ہم اپنے اصلی رنگ کو چھپانے کے لئے غازہ استعمال کرتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ ایک دوسرے کو فریب دے رہے۔ لیکن اس سے حالی کی معصومیت میں کوئی فرق نہیں آتا وہ اپنی بے نفسی، ذہنی توازن اور عمل میں اپنے زمانے کے لئے اک مثال تھے۔

نئی تعلیمی تحریک میں اُن کا بہت بڑا حصہ تھا۔ اُن کی مسدس نے پیمبروں کی طرح کام کیا۔ لیکن قوت کی وہ خواہش جو اُن کے ہمعصر فرشتوں میں پائی جاتی ہے، اُن کے ہاں نام کو نہیں۔ شبلی کے خطوط میں، آپ کو چند ایسے نفوس قدسیہ کا تذکرہ ملے گا جنھوں نے ندوہ کو اپنی وجاہت کے اثر سے اپنے ذاتی اقتدار کے لئے استعمال کیا۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن کے نزدیک علم غیب حاصل کرنے کے لئے تو عربی زبان سیکھنا ضروری ہے مگر عملاً اظہار بندگی کے لئے درِ افرنگ کو کافی سمجھتے ہیں، خدا مغفرت کرنے والا ہے۔ دس سال پہلے، ایک خاتون کی تقریر سننے کے لئے طیار نہیں، اور پھر دس سال بعد انہی خاتون کی زیارت کے لئے اپنی ریش مبارک پر عطر ملتے ہیں، کیونکہ حدیث مظہر ہے "مجھے تین چیزیں عزیز ہیں۔ عورت، خوشبو اور نماز"

سرسید کا زمانہ بھی عجیب زمانہ تھا۔ اُن دنوں انسانی ضمیر میں اور فصل کے میووں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ مگر اسی دور میں وہ سچا درویش بھی ہے، جسے انسانوں سے محبت ہے اور جو خدا پہ یقین رکھتا ہے اور جو خدا پہ یقین اس لئے رکھتا ہے کہ اُسے انسانوں سے محبت ہے۔ جو اپنی ساری زندگی زوال کا مرثیہ لکھتا رہا لیکن جس کی اپنی زندگی میں کبھی زوال نہیں آیا جس نے ہر نیک کام میں حصہ لیا لیکن اپنی نیکیوں سے دُنیا کا کام نہیں لیا۔ بزرگوں سے فیض حاصل کیا اور عزیزوں کو فیض پہونچایا۔ نثر لکھی، نظمیں کہیں۔ اپنے ہمعصروں سے محبت کی۔ قوم کے مفید لوگوں کا احترام کیا مگر کبھی کسی انعام کی خواہش نہیں کی۔

حالی ان چند لوگوں میں سے تھے جو غموں کو عارضی سمجھتے اور ان سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ جو غیظ و غضب کو اپنی شکست گردانتے اور اپنے آپ کو خاک میں ملا کر دُنیا کی آلائشوں سے پاک ہو جاتے ہیں، جو اپنی زبان اور زندگی پر فتح حاصل کرتے اور علم کی اُس منزل تک پہونچ جاتے ہیں جسے "انکسار" کہتے ہیں۔ شبلی اُن پر شدید تنقید کرتے ہیں لیکن وہ ہر موقع پر شبلی کو اچھے ناموں سے یاد کرتے ہیں اور اُن کی عزت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق اُردو کے چند ادیبوں پر تنقیدی مضامین لکھنا چاہتے ہیں اُن میں اتفاق سے شبلی کا نام نہیں ہے۔ اُنھیں ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "اِس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلما مولوی شبلی نعمانی کا نام چھوڑ دینے پر ہے اس فروگزاشت کو سوا اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو اور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا"۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔ "شمس العلمار مولانا شبلی کا تقرر مددگار معتمد امور مذہبی کے عہدہ پر عزیزی غلام الثقلین کی تحریر سے معلوم ہو کر بے انتہا مسرت ہوئی ہے۔ اگر آپ ان سے ملیں تو میری طرف سے بعد سلام و نیاز کے کہدیجیے گا کہ اگرچہ آپ کے علم و فضل و لیاقت کے مقابلہ میں یہ عہدہ چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ مگر بہرحال لاہور کی خدمت سے جس پر مسٹر آرنلڈ آپ کو بلانا چاہتے تھے، میرے نزدیک بہت بہتر ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ آپ کو تصنیف و تالیف کا یہاں زیادہ موقع ملیگا اور قوم کو آپ زیادہ فایدہ پہونچا سکیں گے"۔

شبلی کے سارے مکاتیب پڑھ جایئے، حالی کے متعلق ایسا ایک فقرہ بھی نہ مل سکے گا۔ مگر حالی۔ اُن کا مزاج اور ہے، شبلی تو خیر اُن کی برادری کے لوگوں میں سے تھے۔ انھیں جہاں کہیں اچھے آدمی دکھائی دیتے ہیں، وہ اُن سے محبت کرتے ہیں۔ وقار الملک اور محسن الملک ہی سے انھیں محبت نہیں ہے وہ حکیم اجمل خاں کے حق میں بھی دُعائے خیر کرتے ہیں۔ اُن کے لفظ لفظ سے محبت کی بو آتی ہے۔ حالی ہمیشہ بوڑھے رہے لیکن اُن کی محبت ہمیشہ جوان رہی۔ یہ محبت اپنے اوج پر مسدس میں ملتی ہے ورنہ یوں حالی کے ہاں کب نہیں ملتی اور کہاں نہیں ملتی اپنی پوتی کو ایک جگہ لکھتے ہیں "کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کے آؤ کہ یہاں تمھیں کوئی پہچان نہ سکے اور تم قسمیں کھا کھا کے یقین دلاؤ کہ میں وہی ... ہوں"۔ پھر انہی کو لکھتے ہیں۔ "تمھارا طوطا اچھا ہے اور خوب بولتا ہے اور خوش ہے۔ سُنا ہے کہ جس روز تم یہاں سے روانہ ہوئی تھیں اُس روز تمام دن اُس نے کچھ کھایا پیا نہیں اور سارے دن چپ رہا۔ مگر پھر وہ بات نہیں رہی"۔ اِب جملوں کو دہرانے سے اِک لطیف قسم کا ذہنی انبساط حاصل ہوتا ہے لیکن حالی کے خطوں میں مزاح نہ ہونے کے برابر ہے

ایک دو جملے قلم سے نکل گئے ہیں، لیکن وہ ان کی "بزرگی" کی تلافی نہیں کر سکتے۔ جب حیات جاوید شایع ہوئی تو محسن الملک نے اُس پر تبصرہ کا ارادہ ظاہر کیا۔ اُس کے متعلق ایک صاحب کو لکھتے ہیں "مگر انکا ارادہ ایسا ہی ہے جیسا ہر مسلمان حج کا ارادہ رکھتا ہے" ایک جگہ اپنے صاحبزادے کو لکھا ہے۔ "اب تم خاصکر میرے لئے جوتہ بنوانے کی فکر نہ کرنا ۔۔۔ کیونکہ ۔۔۔۔ ہر ایک جوتہ پاؤں پر غالب آجاتا ہے پاؤں جوتے پر غالب نہیں آتا" یہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں۔ لیکن حالی ان خوشیوں کو بھی عارضی سمجھ کر اہمیت نہیں دیتے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو بھی اہمیت نہ دے، وہ ریت کے ذرّوں کو خاک اہمیت دے گا۔ حالی جہاں غم کا اظہار کرتے ہیں وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی روح اُن کے قبضہ میں ہے حالی یزید کے دربار میں ہوتے تب بھی مرثیہ لکھتے اور جہانگیر کے زمانہ میں پیدا ہوتے تب بھی مرثیہ لکھتے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ حالی غم پسند تھے۔ غم پسند کبھی اچھا مرثیہ نگار نہیں ہو سکتا۔ میری مراد یہ ہے کہ حالی، شخصی نجات کے قایل نہیں تھے اُس کا ذریعہ، حُسن پرستی ہو، فن کاری ہو، رہبانیت ہو یا ان کے علاوہ کچھ اور ہو وہ جماعت کی نجات کے قایل تھے۔ اس لئے ہر وہ منظر جو انسانی زوال کی داستان سُنائے اُن کو متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ کسی کی موت ہو، یا سیاسی انقلاب ہو، اور انسانوں ہی پر کیا موقوف ہے، وہ تو اُس ساحل پر بھی رو سکتے تھے جس میں موجوں کی پیہم یورش سے شگاف پیدا ہوگئے ہوں "قوم کے متعدد کارکنوں کے اُٹھ جانے پر" وہ آنسو بہاتے ہیں۔ "ملکۂ معظمہ کی وفات" پر انھیں افسوس ہوتا ہے۔ "ٹرکی کی جو خبریں ۔۔۔ آرہی ہیں" وہ اُن پر بجلی گراتی ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں "نکمے اور نالایق ٹرسٹیوں کی بھرتی سے جو سرسید کے وقت میں شروع ہوئی تھی" اور اب سنت براہیمی بن چکی ہے، انھیں قلق ہوتا ہے۔ میں اسی کو تو مرثیہ نگاری کہتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ تندرست آدمی وہ ہے، جو غموں پر آنسو بہا سکے اور غموں پر آنسو بہانے اور بہا سکنے کا دوسرا نام انسانیت ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جو مذہب کی طرح ہر جگہ پائی جاتی ہے لیکن اُس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ حالی میں بس یہی ایک بات تھی۔ موت اور ہمارے درمیان جو کچھ ہے وہ کھلونے ہیں۔ دماغ کی آوارگی ہے۔ راتوں کے خواب ہیں۔ بے جا نمایشیں ہیں، کڑی مصیبتیں ہیں، جنھیں دو چار قہقہے رنگین بنا دیتے ہیں۔ حبابوں کی اس قیامت میں، ایک گرم رو ہے جو ہمیں زندہ رکھتی ہے اور زندگی کو ہمارے لئے معتبر بناتی ہے، وہی انسانیت ہے۔ خورشید الاسلام

ایک غلطی کا ازالہ

اگست کے نگار میں غلام سرور صاحب نے اپنے مضمون میں یہ شعر علامہ اقبال سے منسوب کیا ہے:۔

ہمّت ہے تو کر پیدا فردوسِ بریں اپنا
بخشی ہوئی جنّت سے دوزخ کا عذاب اچھا

حالانکہ یہ شعر جناب اسد ملتانی کا ہے اور اس میں فردوسِ بریں کی جگہ "فردوسِ حیات" ہے۔ "اسلم شیرانی"

صنعت وحرفت اور نفسیات

آجکل کی دُنیا ہر چیز کو نفسیات کی نگاہ سے دیکھنے کی عادی ہو چکی ہے۔ چنانچہ اب صنعت وحرفت کو بھی اسی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ماہرین نفسیات کام کے ایسے طریقے رائج کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ بلا مزید تکلیف برداشت کئے ہوئے انسان ایک معینہ مدت میں چھ سو فیصدی زیادہ کام کر سکے۔

صنعت وحرفت میں نفسیات سے کام لینا اگرچہ ہر مہذب ملک نے شروع کر دیا ہے لیکن امریکن ماہرین بہت پیش پیش ہیں اور امریکہ کے مسٹر ٹیلر جن کے نام پر ایک خاص طریق کار جو ٹیلرزم یا ٹیلریت (Taylorism) کہلاتا ہے اس سلسلہ میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

مسٹر ٹیلر نے یہ دیکھ کر کہ مستقل محنت کرنے سے مزدور جلد تھک جاتا ہے، انھوں نے سوچنا شروع کیا کہ اس کا علاج کیا ہے۔ کافی غور کے بعد انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر دورانِ عمل میں مزدور کو تھوڑی دیر تک آرام کرنے دیا جائے تو غالباً وہ زیادہ کام کر سکے گا۔ یہ ترکیب عمل میں لائی گئی اور نتیجہ خاطر خواہ ہوا۔ یعنی وہ قلی جو کوئلہ کی کان میں کام کرتے تھے ان کو ہر آدھ گھنٹہ کام کرنے کے بعد پانچ منٹ سستانے کی اجازت دی جاتی تھی اس کے بعد وہ پھر اپنا کام شروع کر دیتے تھے اس طرح ہزار قلیوں کی جگہ صرف پانچ سو قلی کافی سمجھے گئے اور کارخانہ داروں کی آمدنی میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔

مسٹر ٹیلر نے صرف اسی ایک طریقے پر بس نہیں کی انھوں نے ایک چھرے ڈھالنے والے کارخانے میں تمام کام کرنے والی عورتوں پر نفسیاتی تجربات کئے۔ مثلاً وہ عورتیں یا لڑکیاں جو ڈھلے ہوئے چھروں کو ہاتھ میں لیکر خراب چھرے علٰحدہ کرتی تھیں اُن کا نفسیاتی معائنہ اس طرح ہوا کہ اُن سے ایک خاص اشارہ پر ہاتھ کو حرکت دینے کا حکم دیا گیا اُن میں سے جن عورتوں یا لڑکیوں نے کم سے کم وقفہ میں ہاتھ کو حرکت دی وہ پاس ہوگئیں اور باقی فیل پھر ہاتھ سے چھرے چننے کے بجائے ان کو مقناطیسی چمٹے مہیا کئے گئے جس سے خراب چھرے کے نظر آتے ہی وہ چھرے کو پکڑ کر علٰحدہ کر دیتی تھیں اس تجربہ سے چند دنوں میں کارخانہ کا لاکھوں روپیہ کا فایدہ ہوا۔

اصولی طور پر کام کرنے کی طاقت میں دو طریقوں سے اضافہ کیا جا سکتا ہے، اول تو وہ طریقے مدنظر رکھے جائیں جن سے محنت میں کمی اور کام میں زیادتی ہو مثلاً ایسی مشینیں ایجاد کی جائیں جو انسانی طاقت سے چلائی جا سکیں اور دوسرے کام اور آلام کے باہمی تعلق کو نہ بھولا جائے۔ ان دونوں اصولوں کی مثالیں اوپر پیش کی جا چکی ہیں لیکن

مزید وضاحت کے لئے ہم ان کو بالتفصیل بیان کریں گے۔ کام کی کفایت کے سلسلہ میں سب سے زیادہ صحیح حرکات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ بعض حرکتیں دوسری حرکتوں کے مقابلہ میں آسانی سے کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً کسی شخص کو لیجئے وہ یقیناً داہنے ہاتھ سے بائیں کے مقابلہ میں اچھا کام کرسکے گا (بشرطیکہ وہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی نہیں ہے)۔ چنانچہ مشینوں پر کام کرنے، موٹر چلانے، ٹائپ کرنے اور اسی قسم کے دوسرے کاموں میں اس مسئلہ پر بخوبی غور کیا جاسکتا ہے۔

مثال کے طور پر ٹائپ رائٹر ہی کو لے لیجئے۔ ٹائپ کرنے میں ہمارے دونوں ہاتھوں کا استعمال ہوتا ہے لیکن عام طور سے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں کے کام برابر برابر منقسم نہیں ہیں اور ہر ایک اُنگلی کو اسکی کام کرنے کی اہلیت کے مطابق کام نہیں ملتا ہے۔ برخلاف دوسری اُنگلیوں کے داہنے ہاتھ کی کلمہ کی اُنگلی کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے اور کام کی یہ غلط تقسیم انسان کو جلد تھکا دیتی ہے۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ غیر ضروری اور تھکا دینے والی حرکات جو میز کی نامناسب بلندی یا جائے نشست کے سبب کرنی پڑتی ہیں ہمارے کام کرنے کی قوت کو زیادہ صرف کردیتی ہیں اور نتیجہ اچھا نہیں رہتا۔ مثلاً اگر ٹائپ رائٹر کو اتنی بلندی پر رکھا جائے کہ انسان کو کھڑا ہو کر ٹائپ کرنا پڑے تو پھر ٹائپ کی رفتار میں یقیناً کمی ہوجائے گی اور اگر کاغذ دوسری میز پر ہے تو اور دیر ہوگی بعض دفعہ صرف ایک میز کا اضافہ کردینے سے کام میں ۵۰ فیصدی کا اضافہ ہوجاتا ہے۔

کام کی مقدار بڑھانے کے لئے آرام دہ نشست کا انتظام بہت ضروری ہے اگر کام کرتے وقت جسم کو کوئی تکلیف ہو رہی ہو تو اس کا اثر یقیناً کام پر پڑے گا۔ گلبرتھ نامی ایک امریکی ماہر کا خیال ہے کہ اگر کام کرتے وقت پہلو بدل دئے جائیں تو کام کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ اس نے میز اور کُرسی کے استعمال کو بہت ضروری قرار دیا ہے اور کرسی کے متعلق اسکی ہدایت ہے کہ اسکو ایسا بنایا جائے کہ حسب ضرورت اس کی اونچائی کم یا زیادہ کی جاسکے، یہی حال میز کا بھی ہے اس میں بھی ایسی ترکیب رکھی جاتی جاہئے جس سے وہ اونچی یا نیچی کی جاسکے۔ یہ سب ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں کہ اگر ان کو اپنے متفرق کاموں میں برتا جائے تو کام جلدی اور عمدہ ہوسکتا ہے۔

مشینوں کے علاوہ گھریلو کاموں میں کھانے پکانے کو لیجئے۔ گھر کی مامائیں صبح سے شام تک صرف کھانا پکاتی رہ جاتی ہیں دنیا کے اور کسی کام سے ان کو مطلب نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ عقل سے کام لیں اور کھانا پکانے سے پہلے ضروریات کی جتنی چیزیں ہیں سب کو اکٹھا کرکے باورچی خانہ میں رکھ لیں تو یقیناً زیادہ آسانی ہوگی۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ باورچی خانہ بنواتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے، اس میں اتنی جگہ ہو جس میں سب ضرورت کی چیزیں بیک وقت آسکیں یا اس سے نزدیک ترین مقامات پر رکھی جائیں۔

پروفیسر بیڈیل (Bedale) کی تحقیقات اس سلسلہ میں کافی اہم ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ کام کرتے وقت جسم کو جس قدر مناسب حالت میں رکھا جائے گا، بہتر نتیجہ برآمد ہوگا اور کم توانائی خرچ ہوگی، توانائی کے خرچ کو

اس پروفیسر نے نبض کی رفتار، خون کے دباؤ اور صرف شدہ آکسیجن کی مقدار سے ناپا ہے۔ اس کے تجربات کی رو سے کسی خاص بوجھ کو اُٹھا کر لیجانے میں انسانی جسم آٹھ حالتیں اختیار کر سکتا ہے انھیں آٹھ حالتوں کے پیش نظر موصوف نے مختلف لوگوں پر تجربات کئے اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ جب بوجھ کا وزن دونوں ہاتھوں یا بازوؤں پر برابر برابر ہوتا ہے تو آسانی سے اُٹھایا جا سکتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دو برابر وزن کی گٹھریاں باندھ کر دونوں ہاتھوں میں لیجایا جائے۔ اس میں چونکہ صرف دونوں ہاتھ ہی پر زور پڑتا ہے اس وجہ سے زیادہ طاقت صرف ہوتی ہے۔ لیکن جسم کے توازن کے برقرار رہنے کے باعث زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ تیسرا طریقہ بائیں کندھے پر بوجھ رکھ کر لیجانے کا ہے اور چوتھا کسی تسلے یا ٹوکرے میں بوجھ رکھ کر جسم کے سامنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر لیجانے کا ہے اور پانچواں دو رسیوں سے باندھ کر گردن اور بازوؤں سے لٹکا لینے کا ہے بالکل اسی طرح جیسے اسٹیشنوں پر سگریٹ پان والے اپنے بوجھ کو لٹکائے رہتے ہیں۔ چھٹا طریقہ سر پر لیجانے کا ہے ساتواں پشت پر اور آٹھواں چوتڑ پر ان سب طریقوں میں بالترتیب کم توانائی صرف ہوتی ہے مثلاً طریق اول میں سب سے کم، طریق دوم میں اس سے زیادہ اور اسی طرح طریق ہشتم میں سب سے زیادہ۔

اس تجربہ کو ہم مختلف صورتوں اور مختلف کارخانوں میں برت سکتے ہیں اور مزدوروں کو مناسب طریقے سے بوجھ لادنے کے طریقے بتلا کر زیادہ کام لے سکتے ہیں۔

صنعتی کاموں میں بھی یکسوئی کی اسی قدر ضرورت ہوتی ہے جس قدر دماغی کاموں میں۔ چنانچہ کارخانہ داروں کو شور وغل یا خراب روشنی، بری ہوا اور دوسری تکلیف دہ چیزوں کو دور کرنے کا خیال رکھنا چاہئے۔ آج کل ہندوستان اور پاکستان میں جہاں تک مجھے معلوم ہے کام کی خوبی کا اندازہ کام کی مقدار سے کیا جاتا ہے نہ کہ صرف شدہ توانائی سے۔ یہ نہایت ہی غلط طریقہ ہے اور اس سے کام کرنے والوں کی صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

جس طرح انتشار پیدا کرنے والی باتوں کا بُرا اثر پڑتا ہے اسی طرح یکسوئی اور دلچسپی کام کرنے میں مدد دیتی ہے۔ چنانچہ ہمیشہ اس بات کی کوشش ہونی چاہئے کہ مزدوروں کو کام سے دلچسپی ہو اور وہ اس سے زیادہ دلچسپ کسی اور چیز کو نہ سمجھیں اس کے لئے ہمیں، نئے نئے طریقے سوچنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہو سکے تو مزدور کو کام کے انتخاب کا بھی موقع دینا چاہئے۔

صنعتی نفسیات (Industrial Psychology) میں کام اور آرام کے باہمی تعلق کو کافی اہمیت دیجاتی ہے چنانچہ تھکن جسم پر اسی وقت طاری ہوتی ہے جب ہمارا اندرونی نظام جسم کی صرف ہونے والی توانائی کی تلافی نہ کر سکے۔ اور کام اسی وقت بہترین طریقہ سے ہو سکتا ہے جب ان دونوں اسباب کا توازن درست ہو۔ ماہرین نفسیات تھکن کو گراف کے ذریعہ سے ظاہر کرتے ہیں۔ جب تک گراف کی تھکن کی لائن، اچھا کام کرنے والے حصہ میں رہتی ہے اسی وقت تک کام کرنا مناسب ہوتا ہے اور اگر کام کو اس کے بعد بھی جاری رکھا جائے تو یقیناً توانائی کا خرچ کام کی مقدار کے مقابلہ میں

زیادہ ہونے لگے گا۔ تھکن پر جن مختلف ماہرین نے تجربات کئے ہیں ان میں گلبر تھ اور شیپارڈ کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں، شیپارڈ نے ایک اوسط درجہ کے مزدور کے واسطے دن میں نو گھنٹے کام تجویز کیا اور اس نو گھنٹہ میں ۱½ گھنٹہ آرام کا تجویز کیا اور وہ اس طرح کہ ۴۸ منٹ کام کر چکنے کے بعد آٹھ منٹ آرام کے رکھے جائیں۔ پروفیسر جی۔ ای فلپس نے اسی طرح دماغی کام کرنے والوں کا بھی معائنہ کیا اور تقریباً یہی نتیجہ نکالا۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالنا چاہئے کہ ہر کام میں ۴۸ منٹ کام کرنے کے بعد آٹھ منٹ کا آرام دیا جائے۔ ایک مل میں سفید رومال تہہ کرنے والوں نے پورے وقت میں سے ۱½ گھنٹہ دوپہر کے وقت آرام کے لئے اور بقیہ ۸½ گھنٹے میں زیادہ سے زیادہ رومال تہ کئے لیکن یہ طریقہ صرف سفید رومالوں ہی پر برتا جا سکا، چنانچہ جب انھیں مزدوروں سے سیاہ حاشیے کے رومال اس طرح ۸½ گھنٹہ کام کر کے تہ کرائے گئے تو کام کی مقدار میں بتدریج کمی ہوتی گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آنکھوں میں لائٹ اور شیڈ کے ملے جلے اثرات کس قدر جلد تھکن پیدا کر دیتے ہیں۔ دماغی اور جسمانی کام کرنے کے یہ دونوں طریقے "قطعی" حیثیت نہیں رکھتے لیکن یہ ضرور ہے کہ تقریباً ہر کام میں اس کی نوعیت کے مطابق مناسب تبدیلیاں کر کے ان کو استعمال کیا جا سکتا ہے اور اتنا تو تیقن کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دیر تک کام لینے کے بجائے درمیان میں کام کرنے والوں کو آرام کا موقع دیا جائے تو کام کی مقدار کافی بڑھ جائیگی۔

کام کے دوران میں دن کے مختلف حصوں کا بھی اثر کافی نمایاں ہوتا ہے اس کا اندازہ ہم کو ان حادثات کی رپورٹوں سے ہوتا ہے جو مختلف کارخانوں میں ہوتی ہیں۔ صبح کے ابتدائی گھنٹوں میں بہترین کام ہو سکتا ہے لیکن جیوں جیوں دن بڑھتا ہے تھکن کے آثار نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں، چنانچہ دس اور ۱۱½ بجے کے درمیان سب سے زیادہ حادثات رونما ہوتے ہیں اس طرح دوسرے وقت کے کاموں میں ۳½ بجے سے لیکر ۴½ اور پانچ بجے تک کا وقت خطرناک ہوتا ہے۔

مزدوروں کو ہفتہ میں ایک روز چھٹی ملنا لازم ہے، چنانچہ تجربات شاہد ہیں کہ اتوار کو چھٹی منانے کے بعد دوشنبہ کو کام اچھا ہوتا ہے اور منگل کو اس سے بھی بڑھ جاتا ہے اور پھر اس کے بعد بدھ، جمعرات اور دوسرے دو دنوں میں کام کی رفتار سست ہوتی چلی جاتی ہے۔

صنعتی نفسیات میں کام کے اقسام کا مسئلہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے، چنانچہ ایک شخص کو جو کسی خاص کام کے کرنے کا عادی بن گیا ہو اگر دوسرا کام دے دیا جاتا ہے تو عرصہ تک وہ اس کو بہتر طریقہ سے انجام نہیں دے سکتا، کیونکہ پہلی حرکات جسم اور عادات دماغ باقی رہتی ہیں اور نئے کام میں رکاوٹ ڈالنے کا باعث ہوتی ہیں۔ اس کا بھی کارخانہ داروں اور منتظمین کو خیال رکھنا چاہئے۔

مندرجہ بالا اصول کے علاوہ اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر ماحول کے مطابق ریسرچ کر کے مناسب نتیجے نکالے جا سکتے ہیں اور جن کا استعمال صنعتی ترقی پر کافی اثر ڈال سکتا ہے۔

خواجہ جلیل احمد ام۔ اے

ام۔ ان۔ رائے کی مشہور کتاب

"چین کا انقلاب و جواب انقلاب" کا ایک باب

بدیسی حملہ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

انگریز چینی بازار سے دوسرے یورپینوں بالخصوص ڈچوں کو نکال پھینکتے، کیونکہ چین کے اشیاء برآمد کے لئے زرِثمن ادا کرنے کے وسایل دستیاب ہو چکے تھے، یہ افیون تھی جس کی کاشت ہندوستان میں ہوتی تھی، چونکہ چین میں افیون استعمال کرنے کی عادت پھیل گئی تھی، اس لئے اس کی بڑھتی ہوئی مقدار کی درآمد کے لئے اشیاء کی برآمد کے ذریعہ زرِثمن ادا ہو سکتا تھا، بدیسی تجارت کا میزان چین کے خلاف ہو گیا، پہلے بدیسی تجارت کے معنی تھے، چین میں خزانہ کا بہاؤ، اندازہ لگایا گیا ہے کہ سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں کے درمیان، چین میں بینیلا، ریاست متحدہ اور جاپان سے چار سو ملین چاندی کے ڈالر سے کم نہیں پہونچا، سیام اور کوچین چائنا سے بڑی مقدار میں سونا چاندی بھی آیا، انیسویں صدی کے آغاز سے دولت کے بہاؤ کا رُخ بدل گیا، افیون کی قیمت ادا کرنے کے لئے چین سے چاندی کا دھارا بہنے لگا، کیونکہ اشیاء برآمد کے ذریعہ اس کا زرِثمن پورا نہیں ہوتا تھا، ۱۸۳۹ء کی سب سے پہلی انگریزی چینی لڑائی سے قبل، تقریباً نصف صدی کے درمیان افیون کی تجارت کے ذریعہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے تین سو ملین ڈالر نفع حاصل کیا، کھلم کھلا افیون کی تجارت چین کو تباہ کئے جا رہی تھی، دولت کے بھاری بہاؤ نے ریاست کی مالیات کو دفعتاً گرا دیا، چاندی تبادلہ کا معیار تھا، اسکی قیمت بہت بڑھ گئی، محصول جو جنس یا چھوٹے چھوٹے تانبے کے سکوں کی شکل میں جمع ہوتا تھا ان کو ریاست کے خزانۂ عامرہ میں بھیجنے سے قبل چاندی میں منتقل کرنا پڑتا تھا، چاندی کی زیادہ قیمت نے ریاست کی آمدنی کی رقم میں زبردست کمی پیدا کر دی، چونکہ شہنشاہ کا حصہ کسی حالت میں بھی کم نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لئے کمی دیسی بینک والوں یا مہاجنوں کے ذریعہ پوری کی جاتی، جو ریاست کی آمدنی کے انتقال و بدل کے اجارہ دار تھے، صوبائی افسران بھی بہ حیثیت رشوت خور ول یا حقیقی حصہ داروں کے اس کام میں شریک تھے، یہ دونوں ساتھ مل کر پہلے بہت بڑا نفع کر چکے تھے اب انھوں نے شکوہ سنجال

شروع کیں، اور ظاہر کیا کہ حکومت کو ملک سے چاندی کے بہاؤ کی روک تھام کے لئے تدبیریں کرنی چاہئیں، نمک کے اجارہ داروں کو بھی تکلیف پہونچی جو لوگ ملک کی معاشی زندگی کو قابو میں کئے ہوئے تھے، ان کی مانگ کے مطابق اور ریاست کی مالیات کی قریب الوقوع سقیم حالت کے پیش نظر ۱۸۳۹ء میں ایک شاہی کمشنر کو کینٹن میں بھیجا گیا اور ہدایت کی گئی کہ وہ افیون کی تجارت کو دبائے کینٹن اس مضرت رساں بیوپار کا مرکز تھا، گو اس کی قلیل مقداریں دوسرے بندرگاہوں سے بھی گزرتی تھیں۔

بیوپار کے دبانے کے سلسلہ میں سخت کارروائیاں کرنے کے لئے حکومت کے پاس کافی وجہیں تھیں، بیوپار کے سنگین معاشی نتائج کے علاوہ افیون ملک کی اخلاقی جان پر بارِ گراں بنی ہوئی تھی، عملی طور پر حکومت کے تمام افسران اس برائی میں مبتلا تھے، ان حالات کا نتیجہ تھا، نظم و نسق کی درماندگی اور اعلیٰ طبقہ کی رشوت خواری۔

برطانوی نوآبادیاتی خزانہ کے افسر کے اندازہ کے مطابق تقریباً بیس ملین سے کم تر آدمی اس برائی میں مبتلا نہ تھے چونکہ غریب آدمیوں میں سوائے انتہائی گری ہوئی اخلاقی حالت کے اس تعیش میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، اس لئے یہ عادت سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ میں محصور ہو گئی اور سب سے زیادہ وہ افسران عادی ہو گئے جو اس مفرد کے ناجایز بیوپار میں حصہ لے رہے تھے، ۱۸۰۰ء ہی میں افیون کی درآمد روک دی گئی تھی، اور ملک میں اس کی کاشت ممنوع قرار دیدی گئی تھی لیکن ملک کے قوانین سے علانیہ انحراف کرتے ہوئے اس کا بیوپار جاری رہا، ہانگ کانگ افیون کے ناجایز بیوپار کے مرکز کی حیثیت سے پنپتا رہا، بدیسی تجارت کا میزان سارا کا سارا چین کے موافق تھا ۱۸۳۰ء سے یہ ملک کے خلاف ہو گیا حتی کہ آغاز جنگ سے قبل ایک دہا کے درمیان تجارتی اسباب میں ایک موافق میزان قایم تھا، لیکن افیون کی ناجایز تجارت کے سبب میزان کا پلہ بدل گیا، چین کے بین الاقوامی واصل باقی کے حساب میں غیر ظاہری برآمد کا بھاری مد داخل تھا یہ "غیر ظاہری برآمد" مشمول تھی افیون کی ناجایز تجارت کی غیر قانونی ادائگی زرِ ثمن کے سلسلہ میں سونے چاندی کے کثیر بہاؤ پر، اس تباہ کن مفرد کا بیوپار اس حد تک بڑھ چکا تھا، کہ اس نے صرف چینیوں ہی کو نقصان نہیں پہونچایا یہ جدید نظام سرمایہ داری کے حق میں بھی مضر ہو چکا تھا، زیادہ دور اندیش مشاہدین نے شکوہ سنجیاں شروع کیں، اور افیون کی تجارت کو ختم کر دینے کی وکالت کرنے لگے، ہانگ کانگ سے نوآبادیاتی خزانہ کے ایک بڑے افسر نے لکھا، "افیون کے لئے چاندی کے دھارے نے بلاشبہ انگلستان اور چین کے درمیان تجارت روک دی ہے، اور چینیوں کو غریب بنا کر ہماری مصنوعات کی فروخت میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے، سامراج محض رہزنی کے ابتدائی عہد سے تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا، اس ابتدائی عہد میں ہندوستان اور چین سے جو خزانہ بہہ رہا تھا، وہ برطانیہ کے صنعتی انقلاب میں معاون ہوا، اب شہنشاہیت کے عمل کو دوسری صورت اختیار کرنی چاہئے، یہ اپنی مصنوعات وطن کے لئے بازار کا پتہ لگانے کی صورت ہے، نیا عہد آزاد تجارت کا عہد تھا اور افیون کے تاجروں کے حق کے تحفظ کے لئے جو لڑائیاں چین میں ہوئیں وہ اپنے وسیع تر معنی میں تعبیر تھیں بازار کی فتح اور خام پیداوار کے وسایل کے حصول سے، انھوں نے چین میں جدید

سامراج کی بنیاد ڈالی۔

کینٹن میں آکر شاہی کمشنر نے اپنی ہدایت کے مطابق عمل کیا، اس نے افیون کی ساری درآمد ممنوع قرار دیدی۔ اور بدیسی تاجروں کے پاس جو ذخیرہ تھا اس کو ضایع کر دینے کا حکم دیا، آخرالذکر نے اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے سے انکار کیا اس لئے چینیوں نے ممنوع تجارتی مال پر زبردستی قبضہ کر لیا، ایسا کرنے میں وہ بالکل حق بجانب تھے، تقریباً افیون کے بیس ہزار بکس پکڑے گئے اور ان کو برباد کر دیا گیا، ذاتی طور پر انگریز تاجروں کو کوئی تکلیف نہیں دی گئی، گو انھوں نے گستاخی سے حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کی تھی، ان کو چلے جانے کی اجازت دیدی گئی، انھوں نے وطن کی حکومت سے مدد چاہی، انگلستان نے چین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، ایک ایسی جنگ کا جو کسی دوسری غیر حق بجانب جنگ سے جو کبھی لڑی گئی کمتر نہ تھی، نتیجہ پہلے ہی سے معلوم تھا، اسلحہ جنگ کے برتر وسایل کے مالک ہونے کے باعث حملہ آوروں نے آسانی سے متعدد اہم بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا، اور ان کے جنگی جہاز یانگ تسی تک تیرتے چلے آئے۔

افیون کے ناجایز بیوپار کرنے والوں کی اپیل محض بہانہ تھی، جس کا برطانوی حکومت چین کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لئے انتظار کر رہی تھی، ان کی غرض افیون کی تجارت کے تحفظ کی بہ نسبت بہت بڑی تھی، وہ صلح نامہ نانکنگ سے ثابت ہو گیا جس کے ذریعہ لڑائی ختم ہو گئی، انگلستان کی خاص مانگیں جن کو صلح نامہ میں قبول کیا گیا یہ تھیں:۔

ہانکانگ کو حوالہ کر دیا جائے، آزادانہ تجارت کے لئے پانچ بندرگاہیں، کینٹن، اماۓ، فوچو، ننپو اور شنگھائی، کھول دی جائیں، برطانوی رعایا کے لئے ملکی قانون کی دست رس سے باہر ہونے کا حق تسلیم کیا جائے اور اکیس ملین ڈالر تاوان ادا کیا جائے، افیون کا سوال اتنا بھی نہ تھا کہ صلح نامہ میں اس کا ذکر بھی ہوتا، پھر بھی لڑائی کا بین سبب یہی تھا۔

بدیسی شہری متوسط طبقہ جبکہ وطن سے صنعتی اور معاشی انقلاب کے منافع کے بل بوتے پر جاگیردارانہ نظام والے چین کی ممنوع دیواروں پر توپ داغ رہا تھا، زوال پذیر قدیم نظام کو ختم کر دینے کے لئے بہت بڑی فوجیں ملک کے داخلی حصہ میں بھی صف بندیاں کر رہی تھیں، ایک بدیسی طاقت کے ساتھ پہلی ہی سخت لڑائی میں چین کی شکست نے منچو شہنشاہیت کی اہمیت بے نقاب کر دی، اس نے عوام میں ایک بے اطمینانی پیدا کر کے ایک عظیم الشان انقلاب کا ادھم مچایا جو قدیم چین کو فنا کر کے اس کی خاکستر سے ایک نیا چین پیدا کر دیتا، کس طرح بدیسی دخل اندازوں کی رضامندانہ مدد کے ذریعہ ایک بڑے انقلاب کو دبا دیا گیا، اس کا بیان آیندہ باب میں ہوگا، یہاں صرف اس پر غور کیا جا سکتا ہے کہ "تیپنگ بغاوت" کی شکست خصوصیت کے ساتھ بدیسی مداخلت کا نتیجہ تھی اور اس نامبارک حادثہ نے چین میں ازمنہ وسطی کے فرسودہ نظام کو زندگی کا ایک پٹہ دیا، بدیسی حملہ آور ایک ترقی کرنے والے عمرانی طبقہ کی نیابت کرتے تھے اور جاگیردارانہ چین کی پابندیوں کے تحت ٹھاٹھ کے ساتھ رہتے تھے، پھر بھی ایک نازک لمحہ میں وہ رجعت پسند طاقتوں کے ساتھ مل گئے۔

ایک عہد نامہ لکھنا اس پر عمل در آمد کرنے سے آسان تر ہے، کینٹن والوں نے نانکنگ کے معاہدہ نامہ پر ہٹیلے قسم کی مزاحمت کی، اس مزاحمت نے دوسری لڑائی چھیڑ دی جس میں انگلستان صرف تنہا نہ تھا، اس اثنا میں فرانس منظر عام پر آچکا تھا اور روس نے شمال میں اپنا جارحانہ اقدام شروع کر دیا تھا، ۱۸۵۶ء-۱۸۵۸ء کی لڑائی، چین میں ایک بین الاقوامی حملہ کی نیابت کرتی تھی، امریکہ کی ریاستہائے متحدہ بھی شریک ہوگئی، گو یہ شرکت بلاواسطہ نہ تھی، حملہ آور طاقتوں کا کمال جدید تہذیب کی ہمیشہ ایک ٹکسالی مثال رہے گا، نانکنگ کے صلح نامہ کے ذریعہ حملہ آوروں کو جو رعایتیں دی گئی تھیں وہ کوئی حقیقت نہیں رکھتیں اس کے مقابلہ میں جو کچھ پیکنگ معاہدہ کے ذریعہ چھینا گیا جس پر دوسری لڑائی کے بعد دستخط ہوا۔

بندرگاہوں کے علاوہ بدیسی تاجروں کے لئے یانگ تسی بھی کھول دیا گیا کل بدیسیوں کے لئے ان کے مطابق ملکی قانون کی دسترس سے باہر ہونے کے حق کی موصخانہ تعریف کی گئی، مسیحی مبلغین کو بہ حیثیت اپنی اپنی قوموں کے معاشی داخلہ اور سیاسی فتح کے سفرمینا کے ملک میں ہر طرف جانے کی آزادی ملی، چینی حکومت کو پانچ فی صدی سے زیادہ محصول لگانے کے حق سے محروم کر دیا گیا، اور ان تمام باتوں پر طرہ مزید تھا، تاوان جنگ کی ایک بھاری نقد رقم لڑائی کے دوران میں فرانس نے کوچین چائنا پر قبضہ کر لیا تھا، ۱۸۸۳ء میں اس کے ساتھ انام کا بھی اضافہ کر لیا گیا برطانیہ نے اصل سرزمین میں جزیرۂ ہانکانگ کے آمنے سامنے اپنی مقبوضات کا ایک حلقہ بنا لیا، روس کو امور کے شمال میں پورا سمندر کے قریب واقع صوبہ دیدیا گیا، ملکی مقبوضات پر حملہ کا آغاز جو اس طور سے ہوا تھا، اس کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ چین نے نام کے سوا اپنی بادشاہت کا سب کچھ کھو دیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف سامراجی طاقتوں کے نام نہاد "خطہائے اثر" میں بٹ گیا۔

۱۸۷۰ء میں جاپان اس فہرست میں داخل ہوا، اس نے اپنی پر طمع نگاہ کوریا کی حکومت پر ڈالی، جس کو انجام کار اس نے اپنے قلمرو میں شامل کر لیا، ۱۸۹۴ء کی چینی جاپانی جنگ، اور جس کا نتیجہ "صلح نامہ شیمونسکی" ہوا، بدیسی حملہ کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا، وہ زمانہ جس میں سامراجی تجارت کے غیر پابندانہ داخلہ کے لئے چین کا دروازہ زبردستی کھول دیا گیا، اس زمانہ میں چین کی حکومت کے سارے دور دراز حصوں کو بدیسی طاقتوں نے زبردستی چھین لیا تھا ان وسیع مقبوضات پر قبضہ جمانے کا طریقہ بالکل رہزنانہ تھا، چینی مقبوضات کی لوٹ کھسوٹ ایک طویل دلگداز لیکن مانوس کہانی ہے، یہاں اشارہ کر دینے کے علاوہ تفصیل کی ضرورت نہیں، کہ انیسویں صدی کے آخر میں سارا انڈو چائنا چین کے ہاتھوں سے نکل کر فرانس کے، برما، برطانیہ کے، کوریا، جاپان کے اور امور کے شمال میں سارے مقبوضات روس کے قبضہ میں چلے گئے، اس کے علاوہ ترکستان اور منگولیا کو عملی طور پر روس نے اپنے قلمرو میں شامل کر لیا تھا، تبت پر برطانیہ قبضہ کر چکا تھا، اور منچوریا پر حکمرانی کا حق روس اور جاپان کے درمیان مابہ النزاع تھا، حتیٰ کہ چین پر بھی

بین الاقوامی سامراج چھا گیا تھا، کیونکہ ملکی قانون کی دسترس سے باہر ہونے کا حق بدیسیوں کو مل چکا تھا، اور اس نے
ان کو فاتح ہونے کی متکبرانہ شان دیدی تھی، اس حق کی بنیاد پر جو سارے بین الاقوامی قانون اور دستور سے انحراف کر کے
حاصل کیا گیا تھا، مقبوضات کے داخلی حصہ میں جہاں نام کے لئے اب بھی چین کی سلطنت موجود تھی، ایک قسم کی سلطنت
کے اندر چھوٹی سی سلطنت کو نشو ونما ہونے لگی، بدیسی نوآبادیوں کا وجود جو چینی اقتدار سے یکسر آزاد تھیں، اتنی تعداد میں
جنگی مصالح کے مراکز کی حیثیت سے تھا، تاکہ جہاں چینی سلطنت کا بچا کھچا نشان باقی ہے، اس کے خلاف مزید عمل کرنے
میں ان کو استعمال کیا جائے، ہر معاہدہ نامہ میں جو چھوٹا چھوٹا رقبہ بدیسیوں کی نوآبادی کے لئے دیا گیا تھا، اس نے
سامراج کی بیرونی چوکیوں کی صورت اختیار کر لی، چینی سلطنت پر غصب حقیقی الحاق کی صورت نہ اختیار کر سکا، اس کی
وجہ سامراجی طاقتوں کی باہمی رقابت تھی، پرتگالیوں، ڈچوں اور فرانسیسیوں کے عہد وسطیٰ کی حکومتیں اپنے وطنی ممالک
میں مراکز کے انحطاط کے باعث سقیم حالت میں تھیں، جب ہندوستان فتح ہوا، صرف انگلستان ہی ایسا ملک تھا جس میں
جدید سامراج کے سابقہ حالات موجود تھے، لیکن انیسویں صدی کے آخر میں دوسرے ممالک بھی اسی قسم کی منزل پر پہونچے
اسی سبب سے چین، ہندوستان کی راہ پر نہ لگ سکا، گو اس کی فتح کے لئے سفر مینا کا بہت سا کام انگر انجام دے چکے تھے،
چین بین الاقوامی سامراج کی ایک نوآبادی بن گیا یہی جدید چین کی مخصوص شکل ہے اس سے اس کی اقتصادی اور
سیاسی زندگی پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

چینی جاپانی جنگ سے قبل بین سامراجی رقابت کا ظہور نہیں ہوا تھا، کل مسیحی طاقتیں چین پر اپنے حملہ میں متحد تھیں
مرکز سے دور مقبوضات کے بٹوارہ پر کوئی سخت کشاکش نہ تھی، چینی جاپانی جنگ کے نتیجہ میں خاص چین کے بٹوارہ کرنے کا
سوال پیدا ہوا جاپان نے جزیرہ نما لیاؤ ٹنگ کو اپنے قلمرو میں شامل کر لیا، صلح نامہ شیمونوسیکی، رعایات کے لئے مشہور کد و کاوش
کے آغاز کا پتہ بتاتا تھا، ریاستہائے متحدہ امریکہ نے بھی بہ حیثیت ایک سرگرم عنصر کے مداخلت کی، جزائر فلپائن کے حصول
کے بعد سے ہمیشہ امریکہ والوں نے چین کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کی، امریکی مداخلت "دروازہ کھولو" کی
مشہور بے تعلیم" سے شروع ہوئی، اس کی حکمت عملی کے ابہام کو بے نقاب کرنے کے بعد اس تعلیم کے معنی تھے کہ "چچا سام"
بھی چین کے مالِ غنیمت میں اپنا حصہ چاہتے تھے، یہ چین میں وفاقی نظام سلطنت کی امریکی قیادت کا پیش خیمہ تھا، جس
غرض کی تکمیل ایک ربع صدی کے بعد ہوئی، لیکن جس وقت یہ تعلیم پیش کی گئی، امریکی سامراج ابھی اپنے عہد صبوت میں تھا
صورت حال میں موثر طریقہ سے وہ اپنے دعویٰ پر جما نہ رہ سکا، رعایت کے لئے کد و کاوش کی گرمیاں بڑھتی گئیں، اس حد
تک کہ اب چین کی مقبوضاتی سالمیت کے لخت لخت کر دینے کی دھمکیاں دی جانے لگیں، باوجودیکہ تمام طاقتوں نے "بے تعلیم"
کو دیکھاوے کے طور پر تسلیم کر لیا تھا، اتنے آرزومندوں کی موجودگی میں کسی ایک طاقت کا چین کو اپنے قلمرو میں شامل کر لینے
کے امکان کا سوال ہی نہ تھا، چین کی نوآبادیوں نے "خطہائے اثر" پیدا کرنے کی صورت اختیار کی، چین کے کسی قلمرو

میں شامل ہونے کی مزاحمت کبھی خود چین کی طرف سے نہ ہوئی اس کو تو کوئی بھی سامراجی حملہ ختم کر دے سکتا تھا، رسمی الحاق سامراجی طاقتوں کی باہمی رقابت کے باعث رک گیا چین کو اپنے قلمرو میں ملحق کرنے کے لئے کسی طاقت کا ارادہ یقینی طور پر بین سامراجی لڑائی کی اشتعال پیدا کر دیتا، جب تک کہ مسیحی طاقتوں کے درمیان رقابت تھی، ایسا کوئی جھگڑا قابل غور ہی نہ تھا، آخر میں جاپان نمودار ہوا اور روس پر فتح حاصل کر لینے کے بعد اس نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا، اس پر سب سے بڑی مسیحی طاقت ایک مشرک نو دولتا کے ساتھ شرکت میں داخل ہوئی اور اس وقت سے انگریزی جاپانی اتحاد نے مشرق بعید میں بین سامراجی رقابت کو قابو میں کیا، یہاں تک کہ عالمی جنگ کے افسوسناک نتائج نے قدیم اقتدار کے توازن میں انقلاب پیدا کر دیا، "ہے تعلیم" آخرکار اپنے حق پر موثر طریقہ سے جمی رہی، سنہ ۱۹۲۱ء کے واشنگٹن کانفرنس میں امریکی سامراج نے اینگلو جاپانی اتحاد کے ختم کر دینے کی ہدایت کی، آپس میں ایک فوجی معاہدہ کے تحت سامراجی طاقتوں نے اجمالاً نوآبادیاتی نفع کا تسلط قایم کر دیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں بدیسی چین میں بدیسی تجارت کی صورت بالکل بدل گئی تھی، تجارت کا پلہ پورے طور پر اس کے خلاف ہو گیا تھا، وہ سونے چاندی کے بدلے دستکاری کی مصنوعات برآمد نہیں کرتا تھا، افیون بھی چینی درآمد میں اپنی مطلق العنانی کھو چکی تھی، سوتی کپڑوں نے اس کی جگہ لے لی۔ چین ایک حقیقی نوآبادی بن کر رہ گیا، وہ دوسرے ممالک کے بنائے ہوئے سامان کے تبادلہ میں اپنی زراعتی پیداوار دیتا تھا، سنہ ۱۹۰۰ء میں اس کی بدیسی تجارت کے میزان کی قیمت دو سو ستر ملین کے قریب پہونچ گئی تھی، نصف صدی کے اندر اس نے خود کو چہار چند بنا لیا تھا، تجارت کا بہت بڑا حصہ انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اس اثناء میں صنعت نے دوسرے ممالک میں بھی ترقی کر لی تھی، نوآبادیاتی تجارت آزادانہ تجارت کے اصول پر نہیں چلائی جا سکتی تھی، حصول نوآبادیات کے ذریعہ بازار کی اجارہ داری ایک لازمی چیز بن گئی تھی نظام سرمایہ داری جدید سامراج میں ترقی کر گیا تھا، دنیا کے بڑے بڑے صنعتی ممالک نے اپنے بنائے ہوئے سامان کے علاوہ سرمایہ کی بڑھتی ہوئی رقمیں برآمد کرنا شروع کیں، غرض یہ تھی کہ اپنے لئے بازار کی توسیع کریں۔

(باقی)

عبدالمالک آروی

تذکرۂ معرکۂ سخن

(اب کسی قیمت پر نہیں مل سکتا)

لیکن اتفاق سے اس کی چند جلدیں اسٹاک میں مل گئی ہیں۔ اس لئے جن حضرات کو ضرورت ہو فوراً اطلاع دیں۔

قیمت علاوہ محصول ڈاک چار روپیہ

مینجر نگار - لکھنؤ

ترقی پسندی کا بکھرتا ہوا شیرازہ

۱۹۳۵ء میں جدید ادبی رجحانات کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا نام دیا گیا۔ ترقی پسندی، صنعت مطلق نہیں بلکہ ایک صنعت اضافی تھی اور ہے۔ یہ تو ضروریات زمانہ کے مطابق نظریوں میں وسعت پیدا کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے یہ سمجھ لینا غلطی ہوگی کہ ۱۹۳۵ء کے پہلے ہمارے ادب نے ترقی کی طرف کوئی قدم اُٹھایا ہی نہ تھا۔ روایتی ادب کے خلاف بغاوت کا علم سب سے پہلے حالؔی اور آزادؔ نے بلند کیا۔ اکبرؔ، اسمٰعیل میرٹھی۔ چکبستؔ۔ نظرؔ۔ رواںؔ۔ اقبالؔ۔ جوشؔ۔ شبلیؔ۔ رتن ناتھ سرشار۔ رسوا۔ پریم چند۔ سدرشن وغیرہ نے فرسودہ ادبی روایات کو ترک کرکے نئے نئے راستے، نئے نئے اسالیب بیان اور نئے نئے موضوعات ادب بلکہ بعض اوقات نئے نئے افکار و خیالات سے ہمیں روشناس کرایا۔ سیاسیات، اقتصادیات اور فلسفہ کے مفاہیم موضوعِ سخن بننے لگے۔ ادب، زندگی کا آئینہ دار نظر آنے لگا اور زندگی بھی افراد کی نہیں بلکہ معاشرے کی رنج و راحت، عیش و غم سے بھری زندگی۔ غلامی کا احساس، آزادی کا ولولہ، وطن کی محبت، اصلاح کا جذبہ، اقتصادی خوشحالی کی خواہش۔ امارت و غربت کی آویزش۔ ان میں کیا ہے جو ہمیں ۱۹۳۵ء کے پہلے نہیں ملتا۔ اس لئے اگر ہم ترقی پسند یہ دعوےٰ کریں کہ ہم نے کوئی ایسی راہ نکالی ہے جس کی طرف آج تک کسی کی نگاہ نہیں گئی تھی تو یہ بلند بانگ دعوےٰ ہمیشہ محتاجِ ثبوت رہ جائے گا۔

ہم نے جو کچھ بھی کیا وہ یہ کہ ہم نے ترقی پسندی کے مبہم نقوش کو اور اُبھارا۔ اور ترقی پسندوں کے لئے یہ نیا سماجی نقطۂ نگاہ دیا اور اس نقطۂ نگاہ کو ایک ادبی تحریک کی شکل دی۔ ترقی کو سمجھنے اور سمجھانے کی منزل سے گزر کر ہم نے زندگی کو بدلنے کے راستے دکھائے۔ قدامت پرستی، روایت پسندی، رومانویت، فرار پسندی اور فلک سیری کے رجحانات جہاں اور جس شکل میں نظر آئے اُن کو بے نقاب کیا۔ ادب و زندگی کو اس طرح ایک دوسرے کے آمنے سامنے لاکر کھڑا کر دیا کہ دونوں ایک ہی روح کے دو قالب نظر آنے لگے۔ قدامت و روایت پرستی کچھ اصناف سخن یا اسالیب بیان ہی تک محدود نہیں بلکہ سیاست، مذہب، معاشرت، اخلاق، اقتصادیات ہر جگہ اس کا دور دورہ تھا۔ ہم نے ہر محاذ پر قدامت کی مخالفت کی۔ رجعت پسند بہت چیخے چلائے مگر زمانہ آگے بڑھ چکا تھا۔ ہندوستان بیدار ہو چکا تھا۔ یہ صدائیں صدا بصحرا ہو کر رہ گئیں اور ہماری نئی ادبی تحریک "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی شکل میں استوار سے استوار تر ہوتی گئی۔

ہمارے ملک میں بھی ان خیالات کی ترویج کا یہی زمانہ تھا جنہیں ایک نیم متعین مفہوم میں بائیں بازو والوں کے

خیالات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اشتراکیت نوجوانوں کے لئے ایک خوش آئند خواب بھی تھی اور ایک حاصل کرنے کے قابل حقیقت بھی۔ لیکن اشتراکیت ابھی خیالات کی حد سے آگے نہ بڑھ سکی تھی اور اس نے کوئی باقاعدہ عوامی تحریک کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ آج کل کے اشتمالی اُس زمانہ میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور کانگریس کے رکن تھے اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے کانگریس کا ایک جزو تھی۔ اس لئے سوشلسٹ خیالات ان میں سے کسی ایک ادارے کی ملکیت نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ سوشلسٹ پارٹی کو تو چھوڑ دیجئے، ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس کے خیالات، افکار، اعمال اور طویل المدت لائحۂ عمل میں بھی اشتراکیت صاف جھلکتی تھی۔ کانگریس کے پروگرام میں کسان اور مزدور نمایاں ہونے لگے تھے۔ کسانوں اور مزدوروں کے ذاتی ادارے اکثر کاغذی تھے اور جو ادارے قوتِ عمل کے مظاہرے کر رہے تھے ان میں ہر طبقۂ خیال کے کارکن موجود تھے۔ کانگریس سوشلسٹ اور کمیونسٹ دوش بہ دوش کام کر رہے تھے ہڑتالوں میں سب نے حصہ لیا۔ مزدوری کا اضافہ اور عام مراعات اور سہولتوں کی فراہمی کی جد وجہد سب نے مشترکا کی۔ طلبا کی جماعت کا بھی یہی حال تھا۔ ہر ادارہ ایک مشترکہ پلیٹ فارم تھا۔ آپس میں اختلاف ہوتے، ہو کر مٹ جاتے یا پھر مختلف جماعتوں کو مضبوط تر بنانے اور عوامی اداروں پر قبضہ جمانے کی کوششوں پر منتہی ہو جاتے تھے۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے ترقی پسند مصنفین بھی اس عام سیاسی دھارے میں بہتے رہے۔ انھوں نے کبھی کوئی جماعتی لیبل اپنے ماتھے پر نہیں لگایا اور ان حالات میں جماعتی لیبل ہو بھی کیا سکتا تھا۔ اس دور کی ترقی پسندی کا ایک مخلوط سا نظریہ بن گیا تھا اور زیادہ تر ایسے ہی موضوعات شاعری اور ادب کی توجہ کا مرکز بنے جن پر اتحادِ خیال کی گنجائش ہو سکتی تھی یا تھی۔

اس دور کی ترقی پسندی برطانوی شہنشاہیت سرمایہ داری اور زمینداری کی مخالف تھی۔ دولت کی منصفانہ تقسیم آزادی کسان اور مزدور راج کے راگ گاتی تھی۔ ہماری ترقی پسندی کا بنیادی خیال یہ تھا کہ سرمایہ کی نابرابر تقسیم ہی بیشتر مصائب کا سبب ہے اور اس کا حل مساوات اور اجتماعیت کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ترقی پسندوں کو یہ احساس تھا کہ سب سے اہم فریضہ اپنے ملک کو آزاد کرانے اور برطانوی شہنشاہیت کو ختم کرانے کا ہے۔ اس لئے انھوں نے سب سے زیادہ زورِ قلم اس موضوع پر صرف کیا اور اس پہلو پر اتنا زور دیا گیا کہ یہ امر غیر متعین ہی رہ گیا کہ مساوات اور اجتماعیت کی کیا خاص شکل اور اس کے حصول کا کیا طریق کار ہو۔ ذہنی طور پر لوگ واقف تھے۔ کچھ ادیب عملی سیاست میں بھی حصہ لے رہے تھے لیکن ابھی حد بندیوں کا وقت نہیں آیا تھا۔ "انقلاب" اور "بغاوت" کے الفاظ بے باکی سے استعمال کئے جا رہے تھے لیکن نعروں سے زیادہ وقیع نہیں تھے اور ان میں نظریاتی قطعیت بھی نہیں رہی تھی۔ قید و بند کی سختیاں ہنس کے جھیلنا اور سیاسی دشمن کو اخلاقی اور روحانی قوت سے زیر کرنا ہمارا مخصوص طریق کار تھا۔ ہمارے شاعر قید و بند کی سختیاں جھیلتے اور مسکراتے ہوئے گولیاں کھانے کو بھی سراہتے تھے اور اس کو انقلاب مانتے تھے یا کم از کم انقلاب کا وسیلہ جانتے تھے۔ بعض شاعر خونی انقلاب کے بھی نعرے لگاتے تھے اور کبھی حد سے گزر کر دہشت انگیزی، بے امنی و بے نظمی کی

ثنا خوانی کرنے لگتے تھے - عدم تعاون اور ستیہ گرہ کی تحریکوں میں جان تھی اس لئے ان میں بھی "انقلاب" کی شکل نظر آتی تھی - جنگ آزادی کے سپاہیوں کی مدح سرائی کانگریس سے اتفاق خیال رکھنے والوں نے تو کی ہی اور انھیں کرنا ہی چاہئے تھی لیکن ان لوگوں کو بھی کرنا پڑی جو اپنی پارٹی کے اندر اور ڈرائنگ روم اور قہوہ خانوں میں ہماری سیاسی تحریک کو "لورژوا" کہہ دیا کرتے تھے - غرض اس پورے دور کے ادب کا جایزہ لینے والا یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ترقی پسندی کی تحریک کسی خاص کسی خاص سیاسی جماعت کی تحریک نہ تھی اور اس میں حصہ لینے والے اور اس کو فروغ دینے والے ہرگز ایک ہی جماعت کے ارکان نہ تھے -

پھر ۱۹۴۲ء آیا - ہماری جنگ آزادی کا سنگ میل - یہ کھوٹے اور کھرے کے پرکھنے کا خاص موقع اور محل تھا - جن لوگوں کا تعلق جنگ آزادی سے گہرا تھا وہ یا تو جیلوں میں بند تھے یا خفیہ طور پر تحریک کو چلانے میں مصروف تھے ۱۹۴۲ء کی تحریک کو کچلنے کے لئے حکومت وقت کو اپنا پورا زور صرف کرنا پڑا اور جبر و تشدد کا وہ بازار گرم ہوا کہ لکھتے ہوئے قلم رک گئے اور بولتی ہوئی زبانیں بند ہوگئیں - لیکن پھر بھی ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے اس تحریک کو اپنایا اور ادب و شاعری کے ذریعہ اس تحریک کی خدمت کی - لیکن وہ ادیب جو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رکن تھے، اس موقع پر نہ صرف یہ کہ اس تحریک سے الگ رہے بلکہ اس کی مخالفت کرتے رہے - جس عالمگیر جنگ میں ہندوستان کو زبردستی اور اس کی مرضی کے خلاف جھونک دیا گیا تھا اس جنگ کو ہمارے بعض ترقی پسند ادیبوں نے "قومی اور عوامی جنگ" کہنا شروع کیا - جس جنگ میں ہندوستان کو ہمیشہ سے زیادہ مجبور و غلام بنایا گیا تھا اس کے بارے میں ہمارا "ترقی پسند" شاعر یہ گانے لگا کہ "یہ جنگ ہے جنگ آزادی" ظاہر ہے کہ نظریاتی اعتبار سے اب ایک ہی راہ پر چلنا پہلے کی بہ نسبت اور بھی مشکل ہوگیا تھا - وہ راہ بہت پیچھے چھوٹ چکا تھا اب دونوں راستے الگ الگ جا رہے -

اس زمانہ میں قومی نظریہ کا طوفان اٹھا - اشتمالیوں نے اس نظریہ کو بھی اپنے نظریاتی سانچے میں ڈھال کر اپنانے کی کوشش کی - ان کو ہندوستان میں ایک نہیں بیسیوں بلکہ اور بیسیوں قومیں نظر آنے لگیں - ہندوستان کی وحدت قومی کے ان منکرین اور قوم پروروں یا اشتراکیوں میں اب اور کیا چیز مشترک رہ گئی تھی - جس نقطہ مشترک سے زاویے کے دونوں خطوط چلے تھے وہ نقطہ مشترک اب بھی کہیں موجود تھا - لیکن زاویہ کے دونوں خطوط الگ ہی ہوتے گئے - ایک دوسرے سے دور ہی ہوتے گئے - ادیبوں نے اور شاعروں نے البتہ نظموں میں اور افسانوں یا ناولوں میں اس تعدد قومیت کا ذکر نہیں آنے دیا - یہ شاید اس کا ثبوت تھا کہ دل اس نظریہ کو قبول نہیں کرتا تھا - لیکن آپس کے مباحثوں اور اکثر ادبی محفلوں میں انھوں نے زبان سے وہی کہا جس کا انھیں حکم ملا تھا - "درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند"

ہمارے اشتمالی ادیبوں نے اس امر کا بروقت احساس کیا کہ اختلاف کی خلیج اب اتنی وسیع ہوگئی ہے کہ اس کا پاٹنا آسانی سے ممکن نہیں ہے - اس لئے انھوں نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ترقی پسندی کی تحریک اب بھی مقبول عوام ہے، ایسے ادیبوں اور

شاعروں کو اپنی ٹوٹی ہوئی صفوں میں شامل کرنا شروع کیا جنھیں وہ کل تک انجمن کے حاشیہ نشینوں میں بھی شمار کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے بلکہ جنھیں وہ رجعت پسند کہا کرتے تھے۔ اب انھوں نے مولوی عبدالحق اور جگر مرادآبادی کے آستانوں پر جبہ سائی شروع کی۔ اس دور میں ترقی پسندی کا سہرا بوڑھوں اور ناکتخداؤں کے سروں پر زیادہ تر باندھا گیا۔ بوڑھوں کی شہرت کا سہارا لیکر اس گرتی ہوئی عمارت کو سنبھالنے کی کوشش کی گئی اور نوجوانوں کو شامل کرکے یہ ظاہر کرنے کی سعی کی گئی کہ اگر یہ انجمن ترقی پسند نہ ہوتی تو نوجوان اس کی طرف کیوں مایل ہوتے۔ ہر کس و ناکس اس کا مستحق تھا کہ وہ ترقی پسندی کی اعزازی سند ہر لمحہ اور ہر وقت حاصل کرلے۔ ظاہر ہے کہ بوڑھے زیادہ دنوں تک ساتھ نہیں دے سکتے تھے اور انھیں ساتھ دینے کی فکر بھی نہیں تھی۔ انھوں نے پہلے ہی اپنے لئے ادب میں جگہ بنالی تھی۔ ترقی پسند اگر انھیں اپناتے تھے تو ان کا نقصان ہی کیا تھا لیکن وہ اس کے لئے بہت دور تک جانے کو طیار نہیں تھے۔ نوجوانوں کا جو طبقہ بعد میں شریک ہوا اس میں "گلزار ادب کے سرخ پھول" کے علاوہ دوسری سرخ کلیاں ابھی تک خندۂ سحر کے لطف کامل سے محروم ہیں۔ غرض ۱۹۴۲ء کے بعد کا ترقی پسند ایک بحرانی دور سے گزرتا رہا اور آج تک سات برس کی طویل مدت کسی خاص جوہر کو ابھارنے، کوکوئی نیا راستہ دکھانے میں بری طرح ناکام رہا۔ جو لوگ ادب کو اسکے صحیح تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے انھوں نے فوراً محسوس کرلیا کہ اب ترقی پسند مصنفین کی انجمن ایسے افراد کی انجمن ہوکر رہ گئی ہے جن کے قلوب پر مہریں لگائی جاچکی ہیں اور جن کے اذہان کی کھڑکیاں کیلیں لگاکے بند کردی گئی ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس تحریک سے کنارہ کش ہوگئے۔ اور جو باقی رہ گئے تھے وہ بھی آہستہ آہستہ کنارہ کش ہوتے جارہے ہیں۔ آخرکار اس کنارہ کشی کا اثر محسوس کیا جانے لگا اور اس انجمن نے "میل ملاپ تحریک" شروع کی۔ اس کے ہم نواؤں نے مکڑیوں کی طرح اپنے جال کو آئینہ خانہ کہنا شروع کیا اور یہ دعوتِ عام دی جانے لگی کہ ہمارے دروازے تو ہمیشہ سے سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کا یہ آخری داؤں بھی خالی گیا کیونکہ دوسرے سیاسی محاذوں پر افتراق وانشقاق کی جو پالیسی چل رہی تھی اور ہر ادارے میں جو واضح گروہ بندیاں ہوتی جارہی تھیں ان کو دیکھتے ہوئے اس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا کہ یہ انجمن کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی اس سیاسی لائن سے انحراف کرسکے گی جس کے مطابق ہر متحدہ پلیٹ فارم توڑا جارہا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور لکھنؤ اور بمبئی کے اجلاس میں اشتراک کا باقاعدہ جنازہ نکالا گیا تھا۔ اور ایک نیا "مینیفسٹو" طیار ہوا۔ اور منظور کرلیا گیا۔ دعوتِ عام اب بھی جارہی ہے۔ لیکن اب انجمن کو فیض کا یہ مشورہ قبول ہی کرلینا پڑے گا۔ کہ

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

ان حالات میں اب ان عناصر کو کیا کرنا چاہئے، جنھوں نے ترقی پسندی کے صحیح مفہوم کو سمجھا ہے اور اسے ملکی اور بین الاقوامی حالات کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نہ تو کمیونزم پر کسی ادارے کی اجارہ داری اور نہ ترقی پسندی پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے جو راہ عمل اختیار کر رکھی ہے وہ اس ملک میں اشتراکیت اور اشتمالیت کو قعر تباہی کی طرف لئے جارہی ہے۔ ترقی پسندی کے سب سے بڑے دشمن اس وقت وہی ترقی پسند ہیں جو اپنی بے راہ روی سے رجعت پسند طاقتوں

کو اُبھرنے کا موقع دے رہے ہیں - جو عوامی تحریکوں کی جڑ کاٹنے میں مصروف ہیں - جن کا پروگرام سراسر منفیانہ ہے - قومی تعمیر کے کاموں سے نفرت اور ایک لایعنی تخریب سے محبت کو انھوں نے اپنا طرۂ امتیاز بنا لیا ہے - مزدور تحریک ہو یا کسان تحریک، طالب علموں کی کی تحریک ہو یا ادبی تحریک ہر جگہ انھوں نے انتشار پیدا کر کے سوشلزم کو نرم اور ترقی پسندی کے راستے میں کانٹے بوئے ہیں - اور گرد کارواں بن کر راہروؤں کی آنکھ میں دھول جھونکنے کی فکر میں لگے ہیں - پھر کیا ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور ترقی پسندی کو بے موت مر جانے دیں - ہم جنھوں نے ترقی پسندی کو اپنے لہو سے سینچا ہے کیا اس تحریک کو بربادی سے بچانے کے لئے کوئی اقدام نہ اُٹھائیں گے -

اس وقت ہمارے ملکی حالات کیا ہیں - عوام جنگ کی لائی ہوئی گرانی سے پریشان ہیں - ملک کے بٹوارے سے پیدا ہونے والے مصائب کی اُلجھنوں میں گرفتار ہیں - پریشان اور سرگرداں پھر رہے ہیں - بالکل اس طرح جیسے گم کردہ راہ ہوں - بیرونی ممالک اپنے اپنے مسایل میں اُلجھے ہوئے ہیں - روس ہو یا برطانیہ، امریکہ ہو یا چین - وہ ہندوستان کو اور ہندوستان کے مسایل کو صرف اپنے مفاد کی عینک سے دیکھ سکتے ہیں - ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے - ہم نے ابھی ابھی آزادی حاصل کی ہے اور ایک اُجڑے ہوئے ملک کو پھر سے بسانے اور خوش حال بنانے کا اہم کام ہمارے سامنے ہے - ہم سے زیادہ کون اس کا متمنی ہو کہ دُنیا میں امن و امان قایم رہے تاکہ ہم کو ترقی کا پورا موقع مل سکے - شہنشاہیت نے ہماری صنعت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے - ہم میں جہالت ہے، غریبی ہے، بیکاری ہے - ہمیں ان سب کے خلاف جنگ کر کے ایک نیا ہندوستان، ایک خوش حال ہندوستان بنانا ہے - اس لئے بین الاقوامی محاذ پر ہماری ساری قوتیں صرف ایک نقطہ کی طرف مرکوز ہیں کہ دُنیا میں امن و امان قایم رہے - جہاں کہیں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امن خطرہ میں پڑ رہا ہے ہم اس خطرہ کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں - ہم نے بین الاقوامی مجالس میں ہمیشہ زبردست اور کمزور ممالک کا ساتھ دیا اور شہنشاہیت اور اقتدار پروری کی پوری مخالفت کی ہے - ہم اپنی آزادی پا کے مطمئن نہیں ہو گئے ہیں، بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ ہر ملک آزاد اور خود مختار ہو - جب تک ہر ملک آزاد نہیں ہو جاتا، دوسرے ملکوں کی آزادی خطرے میں رہے گی لیکن ہم نے اپنا دامن ابھی تک بین الاقوامی گروہ بندیوں سے بچائے رکھا ہے - ہندوستان ایک بڑا ملک ہے، اس کے ذرایع لامحدود اور اس کی ترقی کے امکانات بیحد وسیع ہیں - اینگلو امریکن بلاک ہو یا روس اور اس کے ماتحتین کا بلاک - ہم کسی ایک بلاک میں شریک نہیں ہو سکتے - ہم کسی کے مخالف نہیں، مگر کسی کے حاشیہ بردار بھی نہیں - حلقہ بگوش تو الگ رہی - ہم ایک غلامی سے نکل کر دوسری غلامی میں جانا نہیں چاہتے -

ہمارے بعض ترقی پسند دوست کہتے ہیں کہ دُنیا دو مخالف بلاکوں میں بٹ گئی ہے - ایک اینگلو امریکن بلاک اور دوسرا روسی بلاک اس لئے ہندوستان کو کسی نہ کسی بلاک میں شامل ہونا ضروری ہے - گویا یہ امر تقدیری ہے، اور تقدیر کے لکھے کو مٹایا نہیں جا سکتا - یہ ضرور ہے کہ جنگ عظیم کے بعد روس میں اور اس کے سابق اتحادیوں میں اختلاف بڑھتا چلا جا رہا ہے - اور بعض اوقات ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کسی تیسری جنگ عظیم کی طیاریاں کی جا رہی ہوں - لیکن پھر بھی روس بہت سی باتوں میں اتحادیوں سے صلح کی

گفتگو کرتا رہتا ہے۔ روس کو تو اس کا حق ہے لیکن ہندوستان کو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنے والے ادیب اور شاعر یہ حق نہیں دینا چاہتے کہ وہ اپنے حالات کو دیکھے، گرد و پیش کے واقعات کو جانچے اور اس کے بعد ہندوستانی عوام کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کوئی لائحہ عمل اختیار کرے۔ روس، جس کے پیچھے انقلاب اور انقلاب کے بعد سالہاسال کی قومی جدوجہد اور تعمیری مہم کی تاریخ ہے۔ جس کے ساتھ ممالک سے دوستی اور دشمنی کی داستان وابستہ ہے، جس کے سامنے آج ایک نیا مستقبل اور ایک طویل ماضی ہے۔ زار کے بعد کا ماضی بھی اور زار کے پہلے کا ماضی بھی، جس کے بیشتر ممالک سے صلح و جنگ کے تعلقات رہ چکے ہیں جس کی صنعتی ترقی نقطۂ عروج پر پہونچ چکی ہے، جس کی فوجی طاقت پر خود اسے ناز ہے، جس کے امورِ خارجہ امورِ خارجہ کے خال و خد مخصوص حالات میں متشکل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہندوستان کیسے آنکھیں بند کر کے چل سکتا ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں کیسے ایک دم دفنائی جا سکتی ہیں۔ ایسا کہنا اور اس پر اصرار کرنا صرف یہ کہنے کے مرادف ہے کہ روس، خطا و نسیان سے مرکب ہی نہیں ہے۔ روس کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ یا پھر یہ کہنے کے مرادف ہے کہ کمیونزم، جو دنیا کا صحیح ترین عقیدہ ہے، روس اور روس کی ملکیت ہے، اجارہ داری ہے۔ کمیونزم روس میں پہلے آیا، لیکن ایسا ہونے سے اس کی ملکیت تو نہیں بن گیا، پھر کمیونزم کوئی مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ کوئی الہامی فلسفہ نہیں ہے جس کی حیثیت حرفِ آخر کی ہو۔ یہ دنیا کے اقتصادی مسایل کا ایک حل ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں مادی حالات کے امتیاز سے اقتصادی صورتیں مختلف ہیں۔ بیرونی خاکہ میں یکسانیت کے باوجود اندرونی تفصیلات کے اختلاف سے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ طریقِ عمل مختلف ہوتا جاتا ہے۔ صدیوں پرانی روایات ہوتی ہیں۔ موجودہ سیاسی حالات ہوتے ہیں، صنعتی یا زراعتی معاشیات ہوتی ہے، خاص طرزِ حکومت ہوتی ہے۔ ملک میں عام سیاسی بیداری کی خاص لہریں ہوتی ہیں۔ رجعت پسند طاقتوں کی مختلف شکلیں اور مختلف گروہ ہوتے ہیں۔ ان سب کو پیشِ نظر رکھ کے لائحہ عمل بنتا ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی پالیسیاں بنتی ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان کے حالات مخصوص ہیں اور روس سے بھی اس طرح مختلف ہیں جس طرح برطانیہ یا امریکہ سے۔ پھر ہندوستان کیوں کسی دکسی ٹولی میں شریک ہو جائے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہندوستان کس طرح کے ملکوں سے گھرا ہوا ہے۔ وہ براعظم ایشیا کا ایک جزو اور اہم جزو ہے یہ براعظم اب تک بیرونی اقتدار کے شکنجے میں گرفتار تھا۔ کئی ملک آزادی حاصل کر چکے ہیں اور کئی ملکوں کو اب بھی آزاد ہونا ہے۔ مختلف ممالک میں جنگِ آزادی جاری ہے۔ ہندوستان کی آزادی سے ان ممالک کی تحریکِ آزادی کو خاص تقویت پہونچی ہے اور ہندوستان انھیں ہر طرح اخلاقی سیاسی امداد دے رہا ہے۔ اس سلسلہ میں کئی مرتبہ اس نے بیرونی شہنشاہیتوں سے ٹکر لی ہے اور ایشیا کے آزادی پسند ممالک کا ساتھ دیا ہے۔ اگر ہندوستان شہنشاہیتوں کی ٹولی میں شریک ہوتا تو وہ انھیں کا ساتھ دیتا۔ انجمن اقوامِ متحدہ میں ہندوستان نے کچھ مسئلوں پر روس کے ساتھ ووٹ دیا ہے۔ اگر ہندوستان اپنی خارجہ پالیسی میں برطانیہ اور امریکہ کا تابع مہمل ہوتا تو ایسا کیسے کر سکتا تھا۔ جن لوگوں کی نظر واقعات پر ہے وہ جانتے ہیں

کہ ہندوستان اپنی خارجہ پالیسی میں آزاد ہے اور ترقی پسند اور جمہوری طاقتوں کے ساتھ ہے ۔ دنیا میں امن و امان قایم رکھنے کے لئے وہ حق اور صداقت کے راستے پر چل کر ہر ممکن کوشش اس امر کی کر رہا ہے کہ جنگ کا خطرہ باقی نہ رہے ۔

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا بھی اس کو ضرور محسوس کرتی ہوگی مگر اس نے تو تعصب کی عینک لگا رکھی ہے اور قومی حکومت کو بدنام اور رسوا کرنے کا بیڑا اٹھالیا ہے ←——— وہ یہ کہ رہی ہے کہ ہندوستان تو اینگلو امریکی ٹولی میں شامل ہو گیا ہے اس سے بڑا اتہام اور کیا ہو سکتا ہے ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بمبئی کے اعلان نامے پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے اشارے پر ادیبوں کو دعوت دی ہے کہ وہ بھی اس الزام تراشی میں اس کا ساتھ دیں ۔ جو حضرات کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رکن ہیں وہ تو اس نعرہ بازی میں شریک ہی ہو جائیں گے لیکن جو اس جماعت کے رکن نہیں ہیں ان کے لئے انجمن ترقی پسند مصنفین میں رہنے کا کیا امکان رہ گیا ہے ۔

امور خارجہ سے ہٹکر امور داخلہ کی طرف آیئے تو انجمن ترقی پسند مصنفین نے یہاں بھی الزاموں کی ایک فہرست طیار کر رکھی ہے ۔ ہمیں اس مضمون میں اس سے سروکار نہیں ہے کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے وہ صحیح ہے یا غلط ۔ اور اس سلسلہ میں میں جو رائے بھی دوں گا اسے ممکن ہے کہ جنبہ داری پر محمول کیا جائے ۔ لیکن اس امر کو ضرور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نام نہاد ترقی پسند ادیبوں نے یہاں بھی ایک منفیانہ اور تخریبی روش اختیار کر رکھی ہے ۔ ان کا طریق عمل ہی نہیں بلکہ طریق فکر بھی تخریبی ہے ۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان میں غریبی اور افلاس ہے ، جہالت ہے ، امراض ہیں ، ایک عام صنعتی اور زراعتی زبوں حالی ہے ۔ آخر کل تک ہم اپنی آزادی کے لئے اسی وجہ سے تو جنگ کر رہے تھے کہ ہندوستان کے یہ مصائب دور ہوں اور خوشی اور خوشحالی کا دور شروع ہو ۔ ہم نے سب سے بڑی شہنشاہیت سے ٹکر لی اور اسے شکست دی ۔ آزادی شروع ہوئی اور تعمیری دور کا آغاز ہوا ۔ لیکن بدقسمتی سے تعمیری دور کے ساتھ ساتھ نئی نئی الجھنیں اور مصیبتیں بھی آئیں ۔ آزادی کے بعد ہی فرقہ وارانہ جنون کی آندھیاں اٹھیں اور قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا ۔ لاکھوں افراد بے گھر ہوگئے ، عفت و عصمت جان و مال سب خطرے میں پڑ گئے ، سب کچھ لٹ گیا ۔ ہندوستانی ریاستوں نے سرکشانہ رویہ اختیار کیا ، رجعت پسندوں نے بجھتے ہوئے چراغ سحری کی طرح بھڑکنا شروع کیا ۔ جوناگڑھ ، کشمیر اور حیدرآباد کے مسایل اٹھ کھڑے ہوئے ، ہندوستان نے تن تنہا تمام مسایل اور الجھنوں کا مقابلہ کیا اور ان مسایل کا حل نکالا ۔ امن و امان قایم کیا ، ریاستوں کے اتحاد و انضمام کا کام کیا ، رجعت پسند طاقتوں کو دبایا ۔ یہ ایسی کامیابیاں ہیں جن پر نئی حکومت ہی نہیں بلکہ قدیم حکومتیں بھی فخر کر سکتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوستان بنیادی مسایل کی طرف سے غافل رہا ۔ غلّہ کی پیداوار بڑھانے ، زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنے ، دیہاتوں میں پنچایتی راج قایم کرنے ، بن بجلی کی اسکیمیں چلانے ، نئے کارخانے قایم کرنے نئی صنعتوں کے علاوہ پرانی کی توسیع اور فروغ دینے ، کئی صنعتوں کو قومی ملکیت بنانے کا کام بھی برابر جاری رہا ۔ بیرونی ممالک سے مشینوں اور دوسرے ضروری سامانوں کی درآمد میں مشکلیں پیش آئیں ، مگر ہم آگے ہی بڑھتے رہے ۔ اگر آج ہر شخص اس خاموش اور

آہستہ خرام انقلاب کو محسوس نہیں کر رہا ہے جو مختلف شعبہ حیات میں رونما ہے تو اس کی صرف ایک وجہ ہے۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہندوستان اتنے دنوں سے غلامی کی بدولت زبوں حال رہا ہے کہ خوشحالی کا دور قایم کرنے کے لئے وقت، ہمت اور مسلسل کوشش درکار ہے۔ اس لئے فوری نتائج سے ہندوستان کے منصوبوں کا اندازہ لگانا غلطی ہے دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے حوصلے کیا ہیں اور ہمارے مقاصد اصلی کیا ہیں۔ اور مقاصد کا اندازہ واقعی نتائج سے نہیں بلکہ نتائج کے بنیادی اصولوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ ہم نے جو کچھ کیا ہے اس سے اس سمت کا تعین کیا جاسکتا ہے جس سمت ہم کاروانِ حیات کو لیجانا چاہتے ہیں۔

کچھ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ کیا وہ کم ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہہ سکتے اور کہتے ہیں جو راستہ ہم نے اختیار کیا ہے اسکے علاوہ اور بھی راستے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ ایسی تعمیری تنقید کی جاسکتی ہے اور ہم ایسے ناقدین کے خیر مقدم کو طیار ہیں۔ لیکن یہ نعرہ تو قطعی انقلاب دشمن اور رجعت پسندانہ ہے کہ عوام ترقی کے لئے جو کوششیں کر رہے ہیں ان کو یکلخت بند کر دیں اور سب سے پہلے امن و امان کو ختم کریں، خوب بدنظمی پھیلائیں، جمہوریت کو ختم کر دیں، ترقی کے منصوبوں کو دفن کر دیں، بس گلے پھاڑ پھاڑ کے یہ چلانے شروع کر دیں، صرف رندیوے اینڈ کپنی انقلاب کی گاڑی گھسیٹ سکتی ہے۔ ناکمیونسٹوں کو چھوڑئے۔ پی۔ سی۔ جوشی کی طرح کے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے اہم ترین رکن بھی اس طرح دیوانہ وار بڑھنے کی تاب نہ لاسکے۔ لطف یہ ہے کہ یہ اس وقت ہو رہا ہے جبکہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے لئے یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ اس وقت اپنی حکومت یہاں قایم کرسکے۔ اسوقت کمونسٹ پارٹی ہندوستان کی کمزور ترین سیاسی جماعت ہے اور اگر اس کی سرگرمیاں خفیہ نہ ہوتیں اور اگر اس کے موجودہ لائحہ عمل میں بدنظمی بلکہ بے نظمی پھیلانا شامل نہ ہوتا تو رستوران، کلب گھر، کافی ہاؤس اور کمپوں کی انقلاب انگیز فضاؤں میں ترقی پسند شاعروں کی نظمیں کو نجتیں اور دلچسپ ادبی بحثیں ہوا کرتیں جن میں کچھ لوگ بڑے مفکرانہ انداز میں حصہ لیتے، حالات کا اقتصادی جایزہ لیتے اور شاعروں اور ادیبوں کی تحلیل نفسی کرتے ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملک رجعت پسندوں اور ترقی پسندوں میں بٹا ہوا ہے۔ اگر ترقی پسندوں کو شکست ہوتی ہے تو رجعت پسند طاقتوں کی فتح ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ موجودہ حالات میں ملک اور وطن کو قوی تر بنانا ترقی پسندی کو فروغ دینا ہے۔ لیکن جس بات کو کمونسٹ آج ترقی پسندی کہہ رہے ہیں وہ دراصل تباہی کی طرف لیجانے والی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ ترقی پسندی کے معنی یہ ہیں کہ کانگرس کی پالسی اور سیاسی جماعت کی حمایت کی جائے۔ ترقی پسند کو اجارہ داری سے کیا واسطہ۔ ہر وہ اقدام جو اس لئے کیا جارہا ہے کہ ملک آگے بڑھے اور ترقی کرے ایک ترقی پسندانہ اقدام ہے اور ہمیں اپنا فیصلہ سنانے سے پہلے ہر اقدام کو جانچنا اور پرکھنا ہوگا۔ سیاسی لیبل سے یہ چیزیں نہیں جانچی جاسکتی ہیں۔ ترقی پسندی ہی کی طرح کمونزم کا بھی یہی حال ہے۔ میں نے سطور بالا میں کمونزم کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے بلکہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور اس کے لائحہ عمل کے بارے میں کہا ہے۔ کمیونزم بھی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی اجارہ داری نہیں ہے۔ جیسا کہ پنڈت جواہرلال نہرو نے کہا تھا آج کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا ہی اس ملک میں کمیونزم کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

کمونزم تو ایک سیاسی اور اقتصادی نظریہ ہے اور چونکہ سرمایہ دارانہ نظریوں کے مقابلہ میں یہ ایک ترقی پسندانہ نظریہ ہے اس لئے مذہبی عقیدہ سے مختلف ہے۔ اس میں تبدیلی کا امکان ہے۔ حالات کے تحت کمونزم کی شکلیں، تحریکیں اور حصول مقصد کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ روس میں پرولتاری انقلاب ہوا مگر چین میں زرعی۔ ہندوستان میں بھی اقتصادی انقلاب ہوگا لیکن اس کی بنیادیں خونریزی اور فتنہ و فساد پر نہیں رکھی جاسکتیں۔ آج تمام ترقی پسند عناصر ملک کو اقتصادی انقلاب کے لئے طیار کررہے ہیں، زمینداریاں ختم کی جارہی ہیں، کارخانے اور کاروبار قومی ملکیت بنائے جارہے ہیں، صنعتوں کو ترقی دیجارہی ہے، دیہاتوں میں حکومت خود اختیاری کی بنیادیں ڈالی جارہی ہیں، تعلیم کو عام کیا جارہا ہے۔ امداد باہمی کے اصولوں پر کھیتی کو شروع کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ اور ان سب باتوں کے لئے جو امر ضروری اور لازمی ہے وہ امن وامان کا برقرار رکھنا ہے تاکہ تمام قوتیں ایک ہی نقطۂ نظر پر مرکوز ہوسکیں۔ عوام کی بحالی اور خوشحالی ہی وہ مرکزی نقطہ ہے۔ اس لئے جو ترقی پسند عناصر ہیں ان کا یہ فرض ہے کہ عوام میں مایوسی پھیلانے سے گریز کریں اور ان کی توجہ کو تخریبی کارروائیوں کی طرف مبذول ہونے سے روکیں۔ ان کو امید، ہمت، استقلال اور جذبۂ عمل سے سرشار کریں۔ ان کو دعوتِ عمل دیکر ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اُبھاریں۔ ان کو بتائیں کہ ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے ارکان ان کو یہ بتارہے ہیں، ہمیں آزادی ہی نہیں ملی ہے، ہم نے دھوکا کھایا ہے یا ہمیں دھوکا دیا گیا ہے۔ یہ طریق کار عوام میں ایک قنوطیت اور پسپائی کا جذبہ پیدا کردے گا اور کررہا ہے۔ ہمیں تو عوام کو بتانا ہے کہ عوام ہی نے اپنے قوتِ بازو سے آزادی کی لڑائی جیتی ہے اور بیرونی اقتدار سے چھٹکارا پایا ہے۔ اب غریبی اور جہالت کے خلاف عوام کو جنگ کرنا ہے اور اس تعمیری مہم میں تن من دھن لگا دینا چاہئے۔ ہمیں ایک نیا ہندوستان تعمیر کرنا ہے، غریبوں کسانوں اور مزدوروں کا ہندوستان۔ اس نئے ہندوستان کو ہم اپنے ہی بازوؤں کی قوت اور دلوں کی ہمت سے تعمیر کرسکتے ہیں۔ کوئی بیرونی ملک کہ وہ برطانیہ ہو، امریکہ ہو یا روس ہمارے لئے نیا ہندوستان تعمیر کرنے نہیں آئے گا اور اگر آگیا تو سمجھنا چاہئے کہ جیتی ہوئی بازی ہار گئے۔ آزادی کی قیمت ہمیں قوتِ عمل اور بیداری ہی سے ادا کرنا ہوگی۔ دوسروں کا دست نگر ہونا یا عوام کو دوسروں کا دستِ نگر ہونے کی ترغیب دینا، شہنشاہیت پرستانہ عیاری ہے اور ہمیں اس سے ہوشیار رہنا چاہئے۔

سیاسی حالات کا جایزہ ذرا طویل ہوگیا۔ لیکن میں نے ان باتوں پر تفصیلی بحث صرف اس لئے کی ہے کہ یہ باتیں عام طور سے کہی جارہی ہیں اور ترقی پسند عناصر کو گمراہ کرنے کے لئے نئے راستے نکالے جارہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب ہم آزاد ہیں، ہم ملک دشمنی اور انقلاب دشمنی کو کسی طرح روا نہیں رکھ سکتے۔ جو لوگ اس وقت تخریب کی دعوت دے رہے ہیں وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ملک تعمیری کاموں کی طرف اپنی توجہ مرکوز نہ کرسکے اور اس طرح کسی نہ کسی شکل میں دوسرے ملکوں کا دست نگر بننے پر مجبور ہو جائے اور پھر کمونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بقول روسیوں کی ٹولی یا انگریزوں اور امریکنوں کی ٹولی میں آنکھیں بند کرکے شامل ہو جائے لیکن یہ خیال ہے، محال ہے اور جنون ہے۔ اب ہم آزاد ہیں اور اپنی آزادی کو ہر قیمت پر برقرار رکھیں گے۔ جو لوگ ہم سے ٹکراتے ہیں وہ ہمارے آہنی ارادوں سے واقف نہیں ہیں۔ اس لئے انھیں بروقت آگاہ کردینا ضروری ہے کہ جو عناصر ملک کی ترقی کی راہ

میں حایل ہوں گے وہ ہمارے عمل کے تیز رو دھارے میں بہ جائیں گے اور ہماری وجہ سے نہیں بلکہ اپنی بے راہ روی کے ہاتھوں محضرِ فنا پر دستخط کریں گے۔

سیاسی حیثیت سے قطع نظر ادبی حیثیت سے بھی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ہمنوا کوئی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ کمونسٹ پارٹی والے ترقی پسند ادب کو اپناتے ہیں تو وہ بھول جاتے ہیں کہ جن لوگوں نے ترقی پسند ادب سنوارا اور کوئی خاص طرز ادا اور اسلوب بیان دیا وہ بدقسمتی سے کبھی اس جماعت کے باقاعدہ رکن نہیں رہے۔ پریم چند، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی، جوش، فیض، ن، م، راشد، فراق، ملا، مجنوں گورکھپوری، خواجہ احمد عباس، حد یہ ہے کہ کرشن چند بھی! - مجاز اگر مزاجاً کچھ کمونسٹ نظر آتے ہیں تو اسے اپنا حسن نظر سمجھئے ورنہ بیچارا نہ تو عملاً کمونسٹ ہے اور نہ فکر و نظر کے اعتبار سے کمونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بتائے ہوئے راستوں کا راہی۔ عبادت بریلوی نے بھی حال ہی میں کچھ فریاد کی ہے اور سنا گیا ہے کہ ترقی پسند حلقوں نے اس کو بورژوا ثابت کرنے کی کوشش کی اور بڑی برہمی کا اظہار کیا۔ حالانکہ اس بندۂ مجبور نے ترقی پسند مصنفین کی موجودہ انجمن سے اختلاف رکھنے والوں کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا مگر ادبی آمریت ان جرایم کو کب معاف کرتی ہے۔

غرض آج ترقی پسند انجمن کے موئیدین اور مقتدین کی حالت ایک مختصر سے ادبی فرقہ کی ہے جو ملت حقہ سے الگ ہو کر اور بھی تنگ نظر بن گیا ہے۔ تنگ نظری اور تنگ ظرفی اس کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ اس کی صفوں میں آج ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ نوخیز کیفی اعظمی، میر کار وال اور حضرت آل احمد سرور ساربان اعظم۔ اگر یہی مکتب اور یہی ملا رہے تو ان بچوں کا خدا ہی حافظ ہے جو نام نہاد انجمن ترقی پسند مصنفین سے آج بھی وابستہ ہوں۔ بہر کیف یہ وقت نکتہ چینیوں کا نہیں ہے بلکہ عمل کا ہے اور ایسے تمام حضرات کے لئے جو ترقی پسند ہونے کے باوجود انجمن ترقی پسند مصنفین کے طرز عمل سے بیزار ہیں، یہ لازم ہو گیا ہے کہ وہ کوئی عملی اقدام اٹھائیں۔ انجمن مصنفین ہند Indian Writers Congress کا قیام اسی خیال کی عملی تفسیر ہے۔ اس کی شاخ لکھنؤ میں قایم ہو چکی ہے اور بہت جلد ایک صوبائی کانفرنس طلب کی جانے والی ہے امید ہے کہ دوسرے صوبوں میں بھی جلد ضروری اقدامات کئے جائیں گے اور یہ انجمن ملک کے تمام ترقی پسند عناصر کی حقیقی معنوں میں نمایندہ ثابت ہو گی۔

علی جواد زیدی

مذہب اور فلسفۂ مذہب

دونوں مع محصول دو روپے (عگار) میں

منیجر نگار لکھنؤ

ہندوستانی گیت

پنگھٹ کے گیت بھی مردوں اور عورتوں دونوں کے ہوتے ہیں۔ لیکن عورتوں کے بنائے ہوئے پنگھٹ کے گیت زیادہ لطیف اور پاکیزہ ہیں۔ مثلاً ذیل کا گیت کورس کے ساتھ گایا جاتا ہے (سب ملکر گاتی ہیں)

چلو نیر بھرن پنگھٹ سجنی ------ چلو نیر بھرن پنگھٹ سجنی

پنیا بھرن کیسے جاؤں سکھی ری۔

غریب پانی بھرنے والی کا یہ ڈر کبھی کبھی سامنے بھی آجاتا ہے اور چھیلا پنگھٹ پر آدھمکتے ہیں، لڑکی خوشامد کرتی ہے:-

موہے چھیلا گگریا بھر لینے دے

بھر لینے دے رے سنوریا بھر لینے دے۔ موہے چھیلا ------

نیم دھرم کی موری گگریا

سیس پہ بھر کے دھر لینے دے۔ موہے چھیلا -----

بانکی گوالن بانکا چھیلا

رس کی بتیاں کر لینے دے۔ موہے چھیلا ------

معمولی خوشامد سے کام بنتے نظر نہ آیا تو اپنے نیم دھرم (عصمت وعفت) کا واسطہ دیا کہ یہ گگری میری عصمت وعفت کی ضامن ہے

دیہاتی گیتوں میں موسموں کا بڑا اثر ہے اور موسم بھی خالص مقامی۔ یعنی برسات کے بادل، اندھیری راتیں۔ بجلی کا کوندا ہلکی ہلکی پھواریں۔ مور پپیہے اور داور کا شور۔ چاہنے والا پردیس میں ہے۔ بیوی ہمہ تن انتظار ہے اور انتظار بھی ایک شب کا نہیں مہینوں کا اور بعض اوقات برسوں کا۔ لیکن فرقت کی ستائی ہوئی عورت جنگل کی راہ نہیں لیتی بلکہ وہ اپنی ہم جنسوں اور ہمجولیوں میں رہتی ہے جو اسے تسلّی دیتی رہتی ہیں اور ڈھارس بندھاتی ہیں۔

ساون شروع ہوتے ہی عوام کی مصروفیت کا زمانہ آجاتا ہے اور ان کا زیادہ وقت کھیتی کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا ہے اور شوہر کی یہ مصروفیت بیویوں کی مکمل فرصت کا زمانہ ہوتا ہے۔ عورتیں اپنے میکے جاتی ہیں شادی کے بعد بھی ماں باپ کا ابدی تعلق چھوٹ نہیں جاتا ان کے حقوق ختم نہیں ہو جاتے۔ وہ اپنے ماں باپ اور بھائیوں سے اس بات کی متمنی رہتی ہیں کہ انھیں جاؤ چونچلے سے بلایا جائے اور اگر کسی وجہ سے بلانے میں دیر ہو جائے تو ان کی بیتابی غصہ اور رنج انتہا کو پہونچ جاتا ہے۔

گیتوں میں جذبات کی اس کشمکش کے نمونے بہت نظر آتے ہیں، پہلی قسم کا گیت جس میں "پیا پردیس سدھارے" کی دردانگیز آواز سنائی دیتی ہے - برہا یا جدائی کے گیت کہلاتے ہیں۔
موسموں کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی مہینہ ایسا نہیں جس کے گیت موجود نہ ہوں - اس سے ملتے جلتے تہوار دل کے گیت ہیں جو ہولی - بسنت اور دیوالی کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں - تہوار اور میلے کاروانِ زندگی کے وہ منازل ہیں جہاں عوام کی محنت و جفاکشی آرام کا تھوڑا سا سانس لیتی ہے اور زندگی کی تمام مسرتیں سمٹ کر ان سے ہم آغوش ہو جاتی ہیں - کہنے کو تو گیت چکی چولھے اور چرخے پر بھی گائے جاتے تھے لیکن وہ خوشی حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ رنج بھلانے اور تھکاوٹ کم کرنے کے لئے - پیشہ وروں مثلاً دھوبی - گاڑی بان - سڑک کوٹنے والے مزدور - سب کے گیت اس نوعیت کے حامل ہوتے ہیں - اپنی انتہائی غربت کے باعث یہ لوگ تمدن اور تہذیب کی شاہراہ سے کوسوں دور ہیں اور ان پر زبان کی تبدیلی کے اثرات کم سے کم پڑے - اسی لئے ان کی زبان اتنی غیر معروف اور پیچیدہ ہے کہ اردو داں باوجود کوشش کے اسے نہیں سمجھتے - اعظم کریوی صاحب کی کتاب "دیہاتی گیت" میں ان گیتوں کے مختلف نمونے ملتے ہیں - لیکن ایک چیز قابل غور ہے - ہر مصرع کے آخر میں ان کے یہاں ٹیپ کا بند گانے کا پہلا مصرعہ نہیں ہوتا بلکہ صرف ایک دو لفظ ہوتے ہیں جو بار بار دہرائے جاتے ہیں - مثلاً "ھیس سا"، "ہے راما"، "ہو رام"، "چھیو رام"۔ ان کا تلفظ کچھ اس طرح ادا ہوتا ہے کہ جیسے کوئی پھیپھڑوں میں پوری سانس بھر کر اسے یکدم نکال رہا ہو - اس سے اوپر بیان کئے ہوئے نکتہ پر خاصی روشنی پڑتی ہے یعنی یہ کہ ان گیتوں کا مقصد خوشی یا غم کی لذت نہیں ہوتی بلکہ محنت کرتے کرتے بھول جانے والے سانس کو گریز کا راستہ بہم پہونچانا - لیکن اکثر گیت ایسے مل جاتے ہیں جن میں ان سخت کام کرنے والوں کی چیخ پکار شعوری شکل اختیار کر لیتی ہے -
دیوندر ستیارتھی نے "میں ہوں خانہ بدوش" میں بہار کے ایک اہیر کا گیت نقل کیا ہے - جس کا ترجمہ یہ ہے : "یہ ہمارا برہ گیت ہے - بھیا یہ کھیتوں میں نہیں اگتا - درخت پر نہیں لگتا - یہ تو ہر ایک کلیجہ میں ہے - جب کام کرتے کرتے کلیجہ دھڑکنے لگتا ہے - ہم اپنے برہ کا یہ گیت گاتے ہیں"۔
پیشہ وروں میں ملاحوں کے گیت ذرا مختلف ہیں، لیکن ان میں لطافت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے - خصوصیت کے ساتھ کشمیری عوام کا رومان صرف گیتوں میں ہے - ایک گیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو -

"پیارے گوالے تو میری جھیلم ندی کے کنارے آنا اور یہاں اپنی گایوں کو پانی پلانے کے لئے لانا -
تجھے خوش کرنے کو میں نے ناؤ پر چراغ جلائے ہیں -
میرے پیارے - جھیلم کے کنارے اپنی گائیں لانا -
ترے لئے میں نے ہری ہری اچھی اچھی گھاس رکھی ہے -
اپنی بھیڑ بکریوں کو چرانے کے لئے جھیلم کے کنارے لانا"

دریا اور کشتی ایسے موضوع ہیں جنھوں نے بھگتی کال کے صوفی شعراء کے لئے بھی شعر و شاعری کا مواد مہیا کیا ہے۔ دریا کے ساتھ ڈوبنے کا خیال اتنا قریب ہے کہ موت اپنے تمام فلسفیانہ لوازم کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ دُنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ دُنیا کی مشکلات دریا ہیں جس سے پار ہونا دشوار ہے دھرم کی ناؤ ہے اور ست (حق) کے پتوار ہیں خدا یا پریتم یا پیر اور گرو ناخدا ہے، اس سلسلہ کا ایک گیت ملاحظہ ہو۔ یہ گیت ساون میں بھی گایا جاتا ہے لیکن عموماً زیادہ عمر کی عورتیں گاتی ہیں جن میں دُنیا کی تلخیاں ایک متانت پیدا کر دیتی ہیں۔ گیت میں آواز کا اُتار چڑھاؤ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔

دھیرے بہو ندیا دھیرے بہو - ہم اترے ہیں پار ——

کاہے کی توری نیا رے کاہے کی پتوار

کون ترا نیا کھویا رے کس بدھ اتروں پار —— دھیرے بہو ندیا

دھرم کی بنی موری نیا ری ست کے لگے پتوار

سیاں مورا نیا کھویا رے اس بدھ اتروں پار —— دھیرے بہو ندیا

ہندوستان میں دریاؤں کا جال بچھا ہے اور نہ معلوم ہر صوبہ میں پہاڑوں اور ندیوں سے القاء حاصل کر کے کتنے گیت لکھے گئے ہوں گے۔ دیوندر ستیارتھی کی کتاب کا ایک گیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

"ہیرے سے منڈھی ہوئی میری نیّا -

اراوتی ندی کے کنارے تو ایک رقاصہ کی طرح سرکتی چلی جا رہی ہے

اراوتی کی لہریں تیرے پیچھے پیچھے گھوم رہی ہیں"

دیوندر ستیارتی صاحب کا نقل کیا ہوا ایراوتی کا ایک اور گیت ہے۔ جو جذبات میں ڈوبا ہوا ہے۔ ترجمہ یہ ہے:-

(۱) "ایراوتی - اری او ایراوتی! —— او میری محبوب ایراوتی!

اور سب ندیاں پیاری ہیں —— سب سے پیاری ہے ایراوتی"

(۲) "دن بھر میں ناؤ کھیتا ہوں —— تیرے پانیوں پر - او ایراوتی

ملاح کی زندگی ہے بجائے خود ایک گیت —— تیرے پانیوں پر - او ایراوتی

(۳) "سندر کنواریاں ناچ رہی ہیں - جھوم رہی ہیں —— تیزی سے کبھی دھیرے دھیرے

تم نے یہ ناچ کہاں سیکھا ہے —— بتاؤ بتاؤ ایراوتی کی بیٹیو!

ہم ہیں مور اور تم ہو مورنیاں —— مور مار ڈالے جائیں گے اور تم رویا کرو گی -

دریا کے اس موڑ پر یہ ناچ سیکھا تھا یا اس پہاڑ پر —— جہاں سے ایراوتی نکلتی ہے

تم نے یہ ناچ کہاں سیکھا ؟ ——— بتاؤ بتاؤ ایراوتی کی بیٹیو"

(۴) "ایراوتی میں ہمارے آنسو سماتے رہے ہیں بھائیو! ——— ایراوتی کتنی میلی ہو رہی ہے!

اور جب غریبی ہمارے گلے گھونٹ دے گی ——— ایراوتی اسی طرح بہتی رہے گی"

(۵) "بہتی جا، ماں ایراوتی، بہتی جا ——— تیزی سے کبھی دھیرے دھیرے

ایراوتی! تو چپ کیوں ہے؟ اُداس کیوں ہے؟ ——— ہمارے آنسو شوق سے پئے جا

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم ہیں تیرے بیٹے ——— ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تو ہے ہماری ماں

بہتی جا۔ ماں ایراوتی۔ بہتی جا ——— تیزی سے کبھی دھیرے دھیرے"

عوام کے ادب کے اس خزانہ پر جب نظر پڑتی ہے تو آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُردو نے ولی سے لیکر نظیر اکبر آبادی کے زمانہ تک اور معدودے چند خوشہ چینیوں کو چھوڑ کر موجودہ زمانہ تک ایران اور توران کے لالوں اور موتیوں سے اپنا دامن بھرا لیکن ہندوستان کے ان ہیروں کو جو خاک میں پڑے ہوئے تھے نہ پہچانا اور پہچانا بھی تو قابل التفات نہ سمجھا۔ اس بے التفاتی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ گیتوں کو شاعری کی صف میں کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ان کی زبان کو سوقیوں کی زبان سمجھا گیا۔ مضامین کو رکیک اور پست بتایا گیا۔ طرزِ ادا اور اسلوب کو بھونڈا قرار دیا اور تشبیہات و استعارات میں ندرت نہیں ملی۔

سب سے بڑا اعتراض گیتوں کی زبان پر ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ گیتوں کی زبان کوئی مستقل زبان نہیں ہے مثلاً جانے کے لئے جاوت۔ جاب۔ جیہے وغیرہ شکلیں اختیار کی گئی ہیں۔

لیکن معترضین نے شاید اس پر غور نہیں کیا کہ اس طرح ایک ہی لفظ مختلف لہجوں سے ادا ہو سکتا ہے اور گیتوں کی موسیقیت کا راز اسی میں پنہاں ہے۔ مثلاً پریم۔ پریت۔ پیت یا بالم۔ بلم۔ بالماں۔ بلماں۔ یا شیام۔ سانورے اور سنوریا کو لیجئے کہ ان میں حرکت و سکون کی اتنی پابندی نہیں، برخلاف اس کے مروجہ اُردو میں حرکت و سکون کی اتنی پابندی ہے کہ اس کے لفظ میں اگر تلفظ ذرا بھی تبدیل ہو جائے تو وہ مضحکہ خیز ہو جائے گا۔

دوسرا اعتراض طرزِ ادا اور اسلوب کا بھونڈا پن ہو سکتا ہے۔ گیتوں میں اونچے خیالات اور گہرے جذبات کی کمی نہیں لیکن وہ ادا اس طرح کئے گئے ہیں کہ دیکھنے میں بالکل معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ طرزِ ادا میں جدت یقیناً نہیں ملے گی لیکن سادگی کی تمام باتیں موجود ہیں یعنی الفاظ سہل ہیں۔ تشبیہات قریب الفہم۔ تراکیب میں پیچیدگی نہیں روزمرہ اور محاورہ ہے اور یہ چیزیں جدت کی کمی کو پورا کر دیتی ہیں۔ عوام کے ادب میں جدت کی تلاش مناسب بھی نہیں۔ ان گیتوں کے مخاطب اور خطیب دونوں عوام ہیں۔ ان سے بات کرتے وقت وہی رخ اختیار کرنا پڑے گا جو روزمرہ کی زندگی سے قریب ہو۔ ورنہ سننے والوں کے لئے وہ چیستان بنکر رہ جائے گی۔ اُردو کی مروجہ شاعری کا سارا ساز و سامان یا تو ایران کی زندگی سے

لیا گیا ہے یا دربار اور امراکی زندگی سے - عوام کے پاس برسات کی کیفیت - پھاگن کی مستی - مور پپیہے اور کوئل ہیں - کنول ہے بھونرا ہے - نرگس گل بلبل بادِ بہاری کا تخیل کتابوں میں پڑھکر سمجھا جا سکتا ہے محسوس نہیں کیا جا سکتا مروجہ اُردو شاعری کی جاندار چیزیں بے جان ہو جاتی ہیں اور اُردو گیتوں میں بے جان چیزوں میں جان پڑ جاتی ہے - گیت ہندوستانی چیز ہیں - ان کی ذہنیت ہندوستانی ہے - تشبیہات بھی ہندوستانی ہیں - گیتوں کی ہندوستانیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے مدینہ کے نبی کو اجمیر کے خواجہ کو اور کلیر کے پیر کو بھی ہندوستانی رنگ میں دیکھا - گیتوں میں ہندو اور مسلمانوں کا کلچر قریب ترین نظر آتا ہے - مروجہ اُردو اور مروجہ ہندی شاعری ایک دوسرے سے برسرِپیکار دو سوکنیں معلوم ہوتی ہیں جو خود ایک دوسرے سے الگ ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی الگ کرنا چاہتی ہیں - گیتوں میں دو بہنوں کا سا ملاپ ملتا ہے -

زبان اور کلچر کا یہ دریا شروع شروع میں امتزاج کی دشوار گزار پہاڑیوں سے بہتا ہوا میدان میں آیا - بھگتی کال کے شعراء اور صوفیائے کرام کی ادبی کاوشوں نے معاون دریا بنکر اس میں وسعت اور تعمق پیدا کیا - دربار کی مرتفع سطح نے اس کے دو حصے کر دئے - ایک ٹکڑا اُردو کے وہ شعراء تھے جو ولی سے لیکر نظیر اکبر آبادی تک اس کے ساحل کی تراش خراش اور اس کے پانی کے بہاؤ کو درست کرتے چلے آئے - دوسرا ٹکڑا عوام کے گیت ہیں جس میں عوام کے جذبات کی سچائی اور مظلوم عورتوں کے دل کا پرشور تموج تھا - یہ طبقاتی تفریق صرف امارت اور غربت پر قائم نہیں تھی - کیونکہ شاعر عموماً غیر متمول تھے بلکہ یہ تفریق مختلف طبقات کی ترجمانی کی وجہ سے پیدا ہوئی - نظیر اکبر آبادی بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے - لیکن انھوں نے جب اسی دریا میں غوطہ لگایا تو محسوس کیا کہ :-

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈھ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

یہ گوہرِ زندگی انھیں عوام کی شاعری میں ملا - اور نظیر نے اس گوہر کو صاف کر کے وہ چمک پیدا کی کہ لوگ حیران رہ گئے - بسم اللہ بیگم

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، ماشاء اللہ آپ کا فعل ہے -
معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اس کے واح موجود ہیں -
دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آب حیات کے تصور فرمائیے، اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے - ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی - اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی - یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی یہ دوا نئی نہیں ہے بلکہ ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامزہ دین کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں - یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے - القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آ سکتی - تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں
قیمت فی شیشی ۳ خوراک چار روپیہ (صعہ)
(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس - فہرست دواخانہ مفت منگائیے - میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے
نقالوں سے ہوشیار رہئے - میری ۳۰ سالہ شہرت پر غور فرمائیے -
پتہ :- حکیم ثابت علی شیخ زبان خوش کلام
(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)
محمود نگر ۳ لکھنؤ - یو پی

دُنیا کا مُستقبل

(ایک باب)

آیندہ کیا ہونے والا ہے

اقتصادی بحران اور کساد بازاری کا ہولناک طوفان

(استدلال تمثیلی)

اس وقت دُنیا جس منزل سے گزر رہی ہے اُسکی دشواریوں کا صحیح اندازہ تو زیادہ مشکل نہیں لیکن اس منزل سے گزرنے کے بعد وہ ایک ایسی چٹان پر پہونچنے والی ہے جس کے آگے ایک عمیق تاریک غار کے سوا اسے کچھ نظر نہ آئے گا اور اُس وقت اسکے اضطراب و جنون کا جو عالم ہوگا، اس کا اندازہ یقیناً بہت دشوار ہے۔

انسان تمام ذی حیات مخلوق میں اپنی فکر و عقل کی بنا پر بہت ممتاز ہے اور اس کے ذہنی نشو و نما کی اتنی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں کہ اس کی غیر معمولی فراست سے انکار ممکن ہی نہیں، لیکن جس وقت ہم اس کے نتائج ترقی پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ غالباً انسان کی سب سے بڑی حماقت یہی تھی کہ اس نے عقل سے کام لیا اور وہی چیز جس نے اسے تمام حیوانات سے ممتاز کر دیا تھا، اب اسے جانوروں کے سطح سے بھی نیچے گراتی جا رہی ہے۔

عقل سے کام لیکر اس نے اوزار بنائے، مشینیں طیار کیں، سر بفلک عمارتوں میں رہنے لگا، دولت کے انبار لگائے، اور وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو راحت و نشاط کا انتہائی تصور ہو سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود اُسے چین میسر نہیں، سکون میسر نہیں۔ مشین اسی نے بنائی، لیکن اب مشین اس پر غالب آگئی ہے، دولت اس نے پیدا کی، لیکن اب وہ دولت ہی کا غلام ہے۔ اور اس کی حالت ایک ایسے مستسقی کی سی ہے جو دریا کو بدستور لبریز دیکھ کر سر دھن رہا ہے، ایک ایسے سوار کی ہے جسکے ہاتھ سے باگ چھوٹ گئی ہے اور مرکب اسے جہاں چاہتا ہے لئے جا رہا ہے۔

یوں تو انسان ابتدا ہی سے آہستہ آہستہ اس منزل کی طرف بڑھ رہا تھا، لیکن ۱۴ء کی جنگ نے اسکے قدم بالکل اُکھاڑ دئے، اور حرص و ہوس کے اس طوفان سے بچنے کے لئے جب تنکے کا سہارا بھی اسے نظر نہ آیا تو دوسری لڑائی لڑا دی پر چل کی

زبان میں امن و سکون جیتنے کے لئے) لیکن اس نے اور زیادہ گتھیاں ڈال دیں - اور اب اس کے لئے وہ شاید تیسری لڑائی پھر لڑے گا اور ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا -

---

پچھلی لڑائی کے بعد سے دُنیا جن اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے، لیکن اس کے بعد جو زمانہ آنے والا ہے، اس کی خبر بہت کم لوگوں کو ہے - آج تو صرف یہ رونا ہے کہ اشیاء کی گرانی نے جینا دشوار کر دیا ہے، لیکن تمدن کا ڈھانچہ کسی نہ کسی طرح قایم ہے کیونکہ اگر چیزیں گراں ہیں تو اسی نسبت سے روپیہ بھی وافر ہے - لیکن کل جب اشیاء ارزاں ہو جائیں گی تو وہ وقت بہت زیادہ سخت ہوگا، کیونکہ اُس وقت ان سستی چیزوں کو خریدنے کے لئے روپیہ نہ ہوگا - کارخانے بند ہو جائیں گے، عوام میں تعطل و بیروزگاری بڑھ جائے گی اور کساد بازاری سے نظام تمدن کی ایک ایک چول ڈھیلی ہو جائیگی -

پہلی لڑائی سنہ ۱۴ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۸ء میں ختم ہوئی، اس کے بعد سنہ ۱۸ء سے سنہ ۲۳ء تک کا زمانہ صرف اس کوشش میں صرف ہوا کہ شکست خوردہ قوموں سے کس کس طرح انتقام لیا جائے اور سنہ ۲۵ء تک فاتح قوموں نے اپنے بندرگاہیں وہ سب کچھ حاصل کر لیا جس کی تمنا وہ کر سکتے تھے، لیکن سنہ ۲۹ء کے بعد سے جو زمانہ نے پلٹا کھایا تو سنہ ۳۱ء-۳۳ء تک کساد بازاری کا وہ عالم رہا کہ اقتصادی شیرازہ بالکل درہم برہم ہو گیا اور پانچ سال نہ گزرے تھے کہ اسی آپا دھاپی نے سنہ ۳۹ء میں پھر دوسری عالمگیر لڑائی چھیڑ دی - اور اب اس کے اختتام پر بھی وہی سب کچھ سامنے آ رہا ہے، جو پہلے آ چکا تھا اور کساد بازاری کی وہی صورتیں پھر رونما ہو رہی ہیں جو پہلی لڑائی کے بعد پیدا ہوئی تھیں - ہو سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ پھر لڑائی ہو اور اسی لڑائی کے ساتھ کرۂ زمین پر انسانی آبادی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے -

اس وقت تمام حکومتوں کا قیام و نظام بالکل اقتصادیات سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں توازن قایم رکھنے کیلئے تمام سیاسی و فوجی چالیں چلی جاتی ہیں - اس لئے یہ سمجھنے کے لئے کہ آیندہ ہمیں کن مشکلات کا مقابلہ کرنا ہے - استدلال تمثیلی کے طور پر ہمیں پچھلی جنگ کے اقتصادی نظام کی تباہی و ناکامی کے اسباب کو سمجھ لینا ضروری ہے، اور اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے برطانیہ کو لیتے ہیں -

---

اگر آپ نقشہ میں "برطانیہ عظمیٰ" کی جائے وقوع کو دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ مغربی یورپ کے ساحل سے ہٹ کر دور ایک جزیرہ ہے، سب سے الگ تھلگ اور ممکن ہے اسی کے ساتھ یہ خیال بھی قایم ہو کہ اس نے جو اتنی عظمت دنیا میں حاصل کی ہے اس کا سبب غالباً یہ ہوگا کہ وہ دُنیا میں کسی دوسرے ملک کا محتاج نہیں ہے اور ترقی کے لئے تمام وسایل اسے حاصل ہیں - لیکن حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے - جس حد تک غلّہ کا تعلق ہے اس کا یہ حال ہے کہ اگر وہ باہر سے نہ منگائے تو اس کی نصف آبادی فاقہ سے مر جائے - یہی حال وہاں کی صنعتی خام پیداوار کا ہے کہ اگر وہ صرف اپنے ملک کی پیداوار

معدنیات پر اکتفا کرے تو اس کی صنعت صرف پانچواں حصہ رہ جائے۔ چنانچہ وہ تمام اشیاء نصف سے زیادہ یورپ، ایشیا، افریقہ اور امریکہ سے حاصل کرتا ہے جب کہیں جاکر اس کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔

ان اشیاء کے عوض وہ دوسرے ملکوں کو بعض معدنی پیداوار اور طیار شدہ مال بھیجتا ہے۔ مثلاً کپڑا، لوہا، فولاد، مشینری، کوئلہ، اونی مال اور دوائیں ——— لیکن چونکہ وہ تمام درآمد کی ہوئی اشیاء کی قیمت ادا نہیں کر سکتا یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اس کی برآمد، درآمد کے مقابلہ میں ہمیشہ کم رہتی ہے اسلئے اس کمی کو وہ چار طریقوں سے پورا کرتا ہے کرایہ کے جہاز چلانے، بینکنگ، سود پر قرض دینے اور دوسرے ملکوں کی تجارت میں روپیہ لگانے سے۔ ان ذرائع کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پہلی لڑائی کے بعد ۲۹ء میں جہازرانی سے اس نے ۱۰۳ کرور پونڈ، سودی روپیہ چلانے سے ۶ کرور ۵۰ لاکھ پونڈ اور بیرونی تجارت میں روپیہ لگانے سے ۲۵ کرور پونڈ کمائے۔

اس سے آپ کو کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ غیر ممالک کے بازاروں کا کتنا محتاج ہے اور اسی لئے اگر دنیا میں کسی جگہ اقتصادی رفتار پر ہلکا سا سایہ بھی نظر آتا ہے تو وہ چونک پڑتا ہے۔ دُنیا میں کہیں کسی نئے کارخانہ کی چمنی سے دھواں اُٹھے کسی جگہ کوئلہ کی نئی معدن دریافت ہو، کسی ملک کا دیوالہ نکلے اسے متاثر ہونا ضرور، کیونکہ اس کا اثر کسی نہ کسی طرح اسکی آمدنی پر پڑتا ہے۔

جب لڑائی ختم ہوئی تو برطانیہ بہت خوش تھا اور وہاں کا ہر شخص یقین رکھتا تھا کہ جنگ سے قبل اسکی دولت، کارخانہ داری اور ساہوکاری کی جو ساکھ قایم تھی وہ پھر حاصل ہو جائے گی اسلئے چار سال کی تنگی ترشی کے بعد جو اطمینان میسر آیا تو لوگوں نے دل کھول کر خرچ کرنا شروع کیا اور تجارت دفعتاً چمک اُٹھی۔ لیکن ایک سال نہ گزرا تھا کہ ہوا کا رخ پلٹا اور تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ کیونکہ اس کے مال کی نکاسی دوسرے ملکوں میں نہایت تیزی سے گھٹ رہی تھی اور کارخانوں کے دروازے بند ہوتے جا رہے تھے، یہاں تک کہ جنوری ۳۱ء میں ۱۰ لاکھ سے زیادہ آدمی بیکاری کی مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔

اس کا سبب یہ تھا کہ برطانیہ کے مصنوعات کی مانگ دوسرے ملکوں میں بہت کم ہو گئی۔ جاپان اور ہندوستان میں خود بہت سی ملیں کپڑے کی کام کرنے لگی تھیں، آسٹریلیا اپنی اون کی پیداوار سے خود کپڑے طیار کرنے لگا تھا۔ کوئلہ کی مانگ اس لئے کم ہو گئی تھی کہ جرمنی تاوان جنگ کی ادائی کے سلسلہ میں ۲۰ لاکھ ٹن کوئلہ فرانس کو بھیج چکا تھا اور فرانس یہی کوئلہ سستے داموں ہالینڈ، اٹلی، سویڈن اور ناروے وغیرہ کے ہاتھ فروخت کر رہا تھا۔ اس کا نتیجہ نہ صرف یہ ہوا کہ برطانیہ کا کوئلہ باہر نہ جا سکا بلکہ بار برداری کے جہازوں سے جو آمدنی برطانیہ کو ہوتی تھی وہ بھی کم ہو گئی اور آخر کار جہاز سازی کے کارخانوں میں اس قدر تعطل پیدا ہو گیا کہ یہاں کے دو تہائی کام کرنے والے بیکار ہو گئے۔ برطانیہ کا جو روپیہ بیرونی تجارت میں لگا تھا اس کا نفع بھی کم ہو گیا اور سود کی آمدنی بھی بہت گھٹ گئی، سب سے بڑا قرض روس کی زار حکومت پر تھا سو اسے بالشیوک حکومت نے سب کا سب واپس کر دیا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ صدمہ برطانیہ کو یہ پہونچا کہ اس دوران میں

تمام دنیا کے ساہوکارے کا مرکز نیویارک بن گیا اور برطانیہ کی ساکھ اس لحاظ سے بہت گھٹ گئی۔

ان حالات سے برطانیہ کو صدمہ ضرور پہونچا لیکن وہ مایوس نہیں ہوا۔ لائڈ جارج نے ان مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ اس نے انڈسٹری سے حکومت کا اقتدار ہٹا لیا، بیرونی مال پر محصول بڑھا دیا، عمال کے بیمہ فنڈ میں حکومت نے زیادہ چندہ دیا جس سے مزدوروں کی فاقہ شکنی تو ضرور ہوتی رہی اور اسٹرائک کا خطرہ پیدا نہ ہو، لیکن ۲۰ لاکھ آدمیوں کی بیکاری معمولی بات نہ تھی اس لئے لائڈ جارج کو ہٹا کر کنسرویٹو جماعت نے اپنی وزارت قایم کرکے عنان حکومت بالڈون کے سپرد کر دی۔

کنسرویٹو حکومت کے ارادے بہت اچھے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ برطانیہ کی ساہوکاری کسی نہ کسی طرح پھر بحال ہو جائے اور دوسرے ملکوں کی تجارت میں روپیہ لگا کر اپنی اقتصادی حالت کو پھر درست کرے۔ لیکن یہ بات آسان نہ تھی۔ انگلستان پر امریکہ کا بڑا قرض تھا اور یوروپ کے بہت سے ملک خود انگلستان کے مقروض تھے لیکن نہ وہ خود امریکہ کا یہ قرض ادا کر سکتا تھا اور نہ دوسرے ملک اس کا قرض ادا کر سکتے تھے۔ ان حالات نے انگلستان کی اقتصادی پوزیشن کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ کیونکہ قرب و جوار کے ملکوں میں قرض کے بوجھ کی وجہ سے انگلستان کی مصنوعات کی کھپت بہت کم ہو گئی تھی۔ اس لئے برطانیہ نے یہ کوشش کی کہ امریکہ، انگلستان کو اپنا قرض چھوڑ دے اور انگلستان دوسرے ملکوں کو اپنا قرض معاف کر دے۔ لیکن امریکہ نے اس تجویز کو نہیں مانا اور اس کا قرض دو ارب ۲۰ کرور پونڈ کا بدستور انگلستان پر واجب الادا رہا۔ بالڈوین نے اس کو تسلیم کر لیا اور ۵۲ سال میں بالاقساط ادائی کا وعدہ کر لیا۔ اسی کے ساتھ اسنے سکہ کا معیار بھی سونے میں تبدیل کر دیا۔ اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ انگلستان کی ساکھ پھر قایم ہو گئی، لیکن اس قرض کی ادائی کے لئے جب بالڈون نے لوگوں پر ٹیکس اور تجارتی مال کا محصول بڑھانا چاہا تو لبرل اور لیبر دونوں جماعتوں نے رد کر دیا اور اس طرح بالڈون کی وزارت ختم ہو کر ریمزے میکڈانلڈ کی قیادت میں لیبر پارٹی کی وزارت قایم ہوئی۔

انگلستان کے لئے یہ بالکل پہلا موقعہ تھا کہ لیبر پارٹی کی حکومت قایم ہو اور اس کی صدارت ریمزے مکڈانلڈ ایسے شخص کے ہاتھ میں ہو جو سوشلسٹ خیال کا آدمی تھا لیکن چونکہ خود لیبر پارٹی سوشلسٹ خیال کی نہ تھی بلکہ اسے تجارتی اداروں کی پشت پناہی حاصل تھی جو اس بات پر راضی ہو گئے تھے کہ مزدوروں کی اجرت بڑھا کر کام کے اوقات میں کمی کر دیجائے، اور معدنیات و ریلوے کو حکومت کی ملکیت قرار دیدیا جائے لیکن لبرل جماعت کو یہ بھی منظور نہ تھا اور اس کے ووٹ کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا، اس لئے کساد بازاری کو دور کرنے کے لئے میکڈانلڈ نے یہ تدبیر سوچی کہ جرمنی اور روس کو روپیہ قرض دیا جائے تاکہ وہ انگلستان کی مصنوعات خرید سکیں۔ پارلیمنٹ نے جرمنی کی حد تک تو اس تجویز کو منظور کر لیا، لیکن روس کے معاملہ میں اس نے اتفاق نہیں کیا کیونکہ بالشیوک حکومت سے قرض کی واپسی کی اسے امید نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میکڈانلڈ کی وزارت ختم ہو کر پھر بالڈون کی وزارت آ گئی۔ لیکن یہ سوال بدستور اپنی جگہ قایم رہا کہ انگلستان اپنی قبل از جنگ کی اقتصادی سطح پر کیونکر پہونچ سکے۔

سکۂ طلائی کا معیار قایم کرنے سے صنعتی اداروں کو بہت سی مشکلات پیدا ہوگئیں، کیونکہ انگلستان نے تو یہ وعدہ کر لیا کہ وہ فی پونڈ پورے بیس شلنگ کے حساب سے اپنا قرض ادا کرے گا، لیکن دوسرے ممالک جو انگلستان کے مقروض تھے وہ بہت کم ادا کر رہے تھے، اس لئے لامحالہ ٹیکس کے ذریعہ سے کمی کو پورا کیا جانا تجویز ہوا۔ جس سے انگلستان کی مصنوعات گراں ہوگئیں اور اس کی مانگ دوسرے ملکوں میں گھٹنے لگی۔ اس کا مداوا یہ سوچا گیا کہ اُجرت کم کی جائے اور صنعتی اداروں کی دوبارہ تنظیم کر کے انھیں زیادہ نفع بخش بنایا جائے۔ لیکن اُجرت میں کمی کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئلہ کی کھدانوں کے مزدوروں نے کام کرنا چھوڑ دیا اور ملک کو پندرہ کروڑ پونڈ کا نقصان ہوا۔ چنانچہ بالڈوین کی وزارت پھر معطل ہوئی اور میکڈانلڈ نے دوبارہ اس کی جگہ لی، لیکن مالی مشکلات بدستور اپنی جگہ قایم رہیں۔ لاکھوں بے روزگار انسانوں کو فاقہ سے بچانا، امریکن قرض کی ادائی، دو ارب پونڈ کے وار بانڈس (war Bonds) کا سود بہ شرح پانچ فی صدی خود اہلِ ملک کو ادا کرنا۔ یہ تھیں وہ دشواریاں جن کا کوئی حل سمجھ میں نہ آتا تھا اور آخر کار ۱۹۳۱ء میں برطانیۂ عظمیٰ کی کساد بازاری اپنی انتہا کو پہونچ گئی۔

یہ مضمون نصف باب ہے

حضرت نیاز فتحپوری

کی اس کتاب کا جو "دُنیا کا مستقبل" کے عنوان سے

بالاقساط آیندہ جنوری سے شایع ہوگی

اس باب کا باقی نصف حصہ آیندہ مہینے شایع ہوگا جس میں یورپ و امریکہ کی کساد بازاری کے اسباب پر روشنی ڈالی جائے گی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی اب کساد بازاری شروع ہوگئی ہے اور دُنیا پھر اسی مصیبت میں مبتلا ہونے والی ہے جو جنوری ۱۹۱۴ء کی لڑائی کے بعد اس پر نازل ہوئی تھی۔ اس لئے اس دلچسپ داستان کو غور سے سُنئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا سرمایہ داری کا موجودہ نظام اور مشینی صنعت و حرفت کی فراوانی واقعی کبھی دُنیا میں امن و سکون پیدا کر سکتی ہے۔

حضرت نیازؔ کی یہ معرکۃ الآرا تالیف بالاقساط اسی شرط کے ساتھ شایع ہوگی کہ خریدارانِ نگار میں سے کم از کم ۵۰۰ حضرات دو روپیہ کا اضافہ سالانہ چندہ میں منظور کریں۔ اس وقت تک بہت کم خطوط منظوری کے وصول ہوئے ہیں، اس لئے اولین فرصت میں منظوری یا عدم منظوری کی اطلاع دیدیجئے۔

مینیجر نگار

آٹم بم کے متعلق کچھ جدید معلومات

کامل چار سال کی رازداری کے بعد آٹم بم کے متعلق اب کچھ ایسی نئی باتیں معلوم ہو رہی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ہلاکت آفرینیوں کے جو قصے مشہور ہیں، وہ مبالغہ سے خالی نہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جوہری بم فٹ بال سے زیادہ بڑا نہیں ہوتا، دوسری یہ کہ فی ہفتہ ایک بم سے زیادہ طیار نہیں ہو سکتا اور تیسری یہ کہ ایک بم کی طیاری میں ۱۰ لاکھ ڈالر صرف ہوتے ہیں اور چوتھی یہ کہ روس کو جوہری بم بنانے کی تمام معلومات حاصل ہیں۔

اس بم کی ہلاکت آفرینیوں کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ بھی صحیح نہیں۔ ڈاکٹر لیپ نے جو اس باب میں بڑا وسیع تجربہ رکھتے ہیں، ایک کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور اس میں وہ جن نتائج تک پہونچے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:-

۱۔ کہا جاتا ہے کہ جوہری بم کے گرنے سے بڑے بڑے شہر آن کی آن میں جلکر خاکستر ہو جائیں گے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ہاں اگر خطرہ ہے تو بڑے بڑے شہروں کے صرف ان حصوں کو جہاں آبادی بہت گنجان ہے اور صنعتی کارخانے قریب قریب بکثرت پائے جاتے ہیں۔

۲۔ کہا جاتا ہے کہ جب کسی ساحلی مقام پر پانی کے اندر بم پھوٹے گا تو اُس سے پانی اُچھلے گا اور اس پانی سے ریڈیم کی گرم شعاعیں پھیل کر تمام ساحلی آبادی کو فنا کر دے گی۔ ڈاکٹر لیپ کا خیال ہے کہ امریکہ کو اس سے بہت کم نقصان پہونچے گا کیونکہ اس کے بندرگاہوں کا پانی ۳۰۔ ۴۰ فٹ سے زیادہ گہرا نہیں ہے، اور یہ اتنا اُچھل سکے گا کہ ساحل کے آس پاس مکانات کے علاوہ دور کے مکانوں کو بھی متاثر کرے۔

۳۔ اگر کسی مکان کے اندر فرش کے نیچے چھپا ہوا بم کوئی پھوٹا تو اس کا نقصان ۵۰۰ فٹ کے اندر ہی اندر محدود رہیگا گویا زیادہ سے زیادہ دو عمارتوں کو۔

۴۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ بم کے علاوہ ریڈیم کے ذرات کو بھی منتشر کرکے شہر کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں، کیونکہ اس کے لئے ان ذرات کی بڑی مقدار درکار ہوگی اور ان ذرات کا ذخیرہ عرصہ تک نہیں رکھا جا سکتا۔

۵۔ اگر آٹم بم زمین پر گر کر پھوٹا تو اس کے مہلک اثرات ۴۰۰۰ فٹ کے رقبہ سے آگے نہ بڑھیں گے۔ اور اگر ہوا میں پھوٹا تو بھی اس کے اثرات اتنے دیر پا نہ ہوں گے کہ جان بچانے والا دستہ وہاں نہ پہونچ سکے۔ اسی طرح پانی کے اندر

بم پھوٹنے سے جو لہریں ریڈیم کی پیدا ہوں گی وہ بھی زیادہ دیرپا نہ ہونگی اور جن عمارتوں میں بم پھوٹے گا وہ سال کے اندر ہی اندر پھر سکونت کے قابل ہو جائیں گی۔

۶ - ہوا میں پھوٹنے والے بم جیسے ہیروشیما میں گرائے گئے تھے البتہ امریکہ کے لئے زیادہ خطرناک ہیں۔ کیونکہ یہاں کی آبادی بہت گنجان ہے اور ایک بم سے دو لاکھ انسان بیک وقت ہلاک ہو سکتے ہیں۔

۷ - بم سے بچنے کی بھی صورتیں ہیں۔ زمین دوز کارخانے یا آبادیاں محفوظ رہ سکتی ہیں اور عارضی پناہ گاہوں سے بھی جان بچ سکتی ہے۔ اس غرض کے لئے سیسہ کی دیواروں اور چھتوں کی پناہ گاہیں بہت محفوظ ہیں، لیکن یہ بھی بڑا قیمتی سودا ہے — گیلی مٹی کی ۶ فٹ دبیز چھت بھی یہی کام کر سکتی ہے۔ کنکریٹ کی بنی ہوئی پناہگاہیں بھی کام دے سکتی ہیں۔ بم پھٹنے کی جگہ سے ہزار فٹ کے اندر ۳۲ انچ کی دبیز دیوار درکار ہوگی، ۲ ہزار فٹ کے فاصلہ پر ۲۰ انچ کی، ۴ ہزار فٹ کے فاصلہ پر ۶ انچ دبیز دیوار کافی ہوگی۔ اور ۵ ہزار فٹ کے بعد کسی حفاظت کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس وقت جو بم طیار ہو رہے ہیں وہ ۳ ہزار فٹ سے زیادہ رقبہ کو نقصان نہیں پہونچا سکتے۔

۸ - اگر خشکی کی طرف فوجوں نے حملہ کیا تو آٹم بم بیکار رہے گا کیونکہ وہ صرف چند ہزار گز کے محاذ تک فوجوں کے اقدام کو روک سکتا ہے، حالانکہ فوجوں کا محاذ میلوں تک پہونچتا ہے۔

۹ - جہازوں اور آبدوز کشتیوں پر موجودہ بموں کا استعمال بہت قیمتی ثابت ہوگا کیونکہ ان کے لئے بہت چھوٹے بموں کی ضرورت ہوگی اور چھوٹے بم بن نہیں سکتے۔

اس لئے یہ خیال کرنا کہ آیندہ جنگ کا فیصلہ بم سے ہوگا اور جس فریق کے پاس زیادہ بم ہوں گے وہی کامیاب ہوگا، صحیح نہیں ہے۔

شہوانیات کیا ہے؟

منجملہ ۱۴۲ عنوانات کے چند خاص عنوان ملاحظہ ہوں:- فحاشی کی تعریف اور اسکی ابتدا — شادی، طلاق و خلع — مذہبی فحاشیاں — فحاشی پر عمومی تبصرہ — استلذاذ بالمثل — استلذاذ بالنفس — استلذاذ بالوحوش — فحاشی عہد قدیم میں — فحاشی قرون وسطیٰ میں — عہد جدید اور فحاشی — اخلاق جنسی —

جنسی میلانات اور شہوانی خواہشوں پر اتنا جامع، تاریخی، علمی و نفسیاتی تجزیہ آپ کو کہیں اور نظر نہ آئے گا۔ حضرت نیاز کی سالہا سال کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے اور اردو میں سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر یہی ہے۔

حجم ۴۱۶ صفحات — کاغذ سفید و دبیز — قیمت علاوہ محصول چار روپیہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

تاریخ طبیعی کا ایک ورق

بینائی کے باب میں چڑیوں کا تفوق انسان پر

مخلوقات عالم میں بینائی کے مدارج بہت متضاد اور دلچسپ ہیں۔ ایک طرف کیڑے مکوڑوں کو دیکھئے جو بالکل اندھے پیدا ہوئے ہیں اور دوسری طرف چیل کو دیکھئے جو انسان سے دو چند زیادہ بینائی رکھتی ہے اور شہد کی مکھی تو فوق البنفسجی (Ultra Violet) روشنی میں بھی دیکھ سکتی ہے جہاں انسان کی بینائی بالکل کام نہیں کرتی۔

بہت سی ادنیٰ درجہ کی مخلوقات ایسی ہیں جو آنکھیں نہیں رکھتیں لیکن ان میں روشنی محسوس کرنے کی حس ضرور پائی جاتی ہے اور اس سے وہ دور ہٹ جاتی ہیں۔ آپ گھن کو روشنی میں رکھئے تو وہ فوراً بھاگ کر اندھیرے کی طرف چلا جائے گا۔ ایسے کیڑوں یا جانوروں کو جن میں گھونگھے، کیچوے، اور بعض مچھلیاں بھی شامل ہیں، روشنی کا احساس آنکھوں کے ذریعہ سے نہیں ہوتا، بلکہ آنکھوں کی قسم کے ایک نشان سے ہوتا ہے، جسے آنکھ کی بالکل ابتدائی شکل سمجھنا چاہئے اور جن کے احساس کا تعلق دماغ سے بالکل نہیں ہے۔

جب ہم زیادہ اونچے درجہ کے مخلوقات میں پہونچتے ہیں تو ہم کو آنکھوں کا وجود بھی ملتا ہے۔ مثلاً مچھلیاں جو پانی کے اندر دیکھنے والی اور بعض رنگوں میں تمیز کرنے والی آنکھیں رکھتی ہیں۔

سانپ کی آنکھ بڑی ہوتی ہے لیکن وہ دیکھتا ہے دھندلا۔ برخلاف اس کے چھپکلی کی بینائی بہت تیز ہے اور وہ دور ہی سے مکھیوں کو دیکھ کر دوڑ پڑتی ہے۔ چھپکلی کی ایک قسم ایسی ہے جس کے انسانوں اور بندروں کی طرح پپوٹے بھی ہوتے ہیں۔

کوئی جانور گھٹا ٹوپ اندھیاری میں نہیں دیکھ سکتا، لیکن اُلّو اور بلیاں تاروں کی چھاؤں میں بھی ویسا ہی دیکھ سکتی ہیں جیسے ہم دن میں ——— گدھ اپنے شکار کو میلوں سے دیکھ لیتا ہے اور اُلّو اور شکرا سیکڑوں فیٹ بلندی سے زمین پر ادنیٰ سی حرکت کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔

سمندری یا آبی چڑیوں کی نگاہ اور زیادہ تیز ہے وہ مچھلیوں کو پانی کے اندر دیکھ لیتی ہیں۔ عود بلاؤ اور سیل مچھلی بھی پانی کے اندر دیکھ سکتی ہے۔ وھیل مچھلی کی آنکھ بہت چھوٹی ہوتی ہے لیکن بینائی بہت تیز رکھتی ہے۔

ہرن، لومڑی اور کتے کی بینائی کمزور ہوتی ہے لیکن ان کی قوتِ شامہ اس قدر تیز ہے کہ بینائی کی کمی اس سے پوری ہو جاتی ہے۔

ایک جدید اکسیر

(آریومائی سین)

کچھ سال پہلے ڈاکٹروں نے ایک دوا پنسلین دریافت کی تھی جو سڑی ہوئی اشیاء پر جمی ہوئی پھپھوند سے طیار کی جاتی ہے۔ یہ ان امراض میں بہت مفید ثابت ہوئی ہے، جو جراثیم کسی حصۂ جسم میں سڑاند پیدا کرنے لگتے ہیں اور زہر جسم میں پھیلنے لگتا ہے۔

دوسری دوا اسٹرپٹومائی سین ہے جو حال ہی میں دریافت ہوئی ہے۔ یہ دق کے لئے کافی نفع بخش ثابت ہوئی ہے اور اس کا استعمال عام طور پر ہونے لگا ہے، لیکن ان دونوں دواؤں میں ایک نقص تو یہ ہے کہ وہ انجکشن کے ذریعہ سے خون میں پہونچائی جاتی ہیں اور نازک مزاج لوگ اس کو پسند نہیں کرتے، دوسرے یہ کہ نہ پنسلین سے تمام جراثیم ہلاک ہو سکتے ہیں اور نہ اسٹرپٹومائی سین کا استعمال ہر ڈاکٹر آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے، علاوہ اس کے یہ کہ پھیپھڑوں کی دق کے سوا کسی دوسرے حصۂ جسم کے دقی جراثیم پر اس کا اثر بہت کم ہوتا ہے۔

اس لئے ڈاکٹروں کو کسی ایسی دوا کی تلاش تھی جو ہر قسم کے جراثیم کو ہلاک کر سکے، اور انجکشن کی جگہ کھلائی جا سکے۔

تین سال ہوئے کہ سب سے پہلے ایسی دوا کا علم امریکہ کی تجربہ گاہ لیڈرل میں ہوا جو اک سنہرے رنگ کی خاک ہے اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ ۵۰ قسم کے مختلف جراثیم کو ہلاک کر سکتی ہے اس تجربہ گاہ میں ایک ہندو سائنسداں ڈاکٹر "یلاپ دگدراؤ" بھی کام کر رہا تھا۔ اس نے سو ریسرچ کرنے والوں کی ایک ٹیم طیار کی اور اس دوا کے متعلق تحقیقات شروع کی اس کا تجربہ سب سے پہلے چوہوں پر شروع کیا گیا اور مختلف بیماریوں کے جراثیم ان کے جسم میں پہونچا کر اس دوا کا استعمال کر دیا گیا تو نتائج حیرتناک نکلے۔ پھر اس کے تجربات جب آدمیوں پر کئے گئے، تو اس کے فوائد اور زیادہ دریافت ہوئے، یہاں تک کہ ہر قسم کے زہریلے بخاروں کے لئے بھی اکسیر ثابت ہوئی۔ دق اور کالی کھانسی میں تو اس نے کوئی کام نہیں کیا باقی تمام متعدی امراض میعادی بخار۔ نمونیا، پھیپھڑوں کے پھوڑے سوزاک وغیرہ میں بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔

اس دوا کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کھلائی جاتی ہے اور اگر زیادہ کھائی جائے تو بھی اس سے کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔

مالہ وما علیہ

جناب سیماب اکبرآبادی

کراچی کے ماہنامۂ غزال (اکتوبر) میں حضرت سیماب کی ایک نظم شایع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے "غزال سے" — چونکہ غزال، ہرن کو بھی کہتے ہیں اس لئے انھوں نے ماہنامۂ غزال اور غزالِ صحرائی دونوں کی رعایتیں ملحوظ رکھ کر، اس نظم کے مفہوم میں کہیں کہیں اُلجھن پیدا کر دی ہے۔ اور بعض الفاظ کا استعمال بھی صحیح نہیں کیا ہے۔ نظم یہ ہے۔

آ، بتا دوں تجھ کو رازِ ارتقائے زندگی
اک تگاپوئے مسلسل، ایک جست اور ایک رم

تو نہیں تنہا، کہ ہر دم جادۂ ہستی میں ہے
دستِ قدرت دستگیر و پائے فطرت ہمقدم

صورتِ اسلاف، منزل تک پہونچنا ہے تجھے
ٹھوکریں رستے کی ہیں، کہسار و صحرا اور یم

جانی پہچانی حدوں سے ہے پرے آگے مقام
پھاندنا ہے قلعۂ ذہنِ عرب و سنگرِ عجم

مسلکِ موجود کی تجدید کرنی ہے تجھے
بسکہ فرسودہ ہے ہر عنوانِ تاریخِ اُمم

سوچ وہ حکمت کہ حاصل ہو بقائے جاوداں
اس ادا سے چل، کہ رستے ہی میں رہ جائے عدم

لا اک ایسا زندگی افروز منظر، دیکھ کر
تیری چشمِ سرمگیں کی دیدہ ور کھائیں قسم

نغمۂ تہذیب چھیڑ، آوارہ گانِ دشت میں
خاطرِ صیاد پر آئینِ نو کر مرتسم

یہ پرانی عادتِ خلوت نشینی چھوڑ دے
منتشر طبقوں میں کر اعلان، ہو جائیں بہم

پیش پا افتادہ، لامحدود پہنائے زمیں
وقف ہے تیرے لئے، اس پر نصب کر دے علَم

عام کر صحرا نشینوں میں تمدن کی صلا
بربریت اور وحشت کو مٹا دے یک قلم

بے زبانی کو زباں دے، خامشی کو نطق دے
تاکہ یہ پُرہول سناٹا بیاباں کا ہو کم

اپنا رشتہ نغمہ سنجانِ چمن سے جوڑ کر
جمع کر دشت و دمن کا افتخارِ منقسم

ارتقائی کارنامے جب ترے کھلنے لگیں
ہو تجھے بالیدگی پیشِ غزالانِ حرم

ا- پہلے شعر میں رَم، غزالِ صحرائی کی رعایت سے تو ٹھیک ہے، لیکن پہلے مصرعہ کو دیکھتے ہوئے جس میں ماہنامۂ غزال سے

خطاب کیا گیا ہے، یہ لفظ مدعا کے بالکل منافی ہے۔

تگاپوئے مسلسل اور جست تو یقیناً رازِ ارتقا ہو سکتے ہیں، لیکن رَم جس کے معنی فرار کے ہیں ارتقا کے بالکل منافی ہے۔ دُنیا میں ترقی کے لئے استقامت کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ "فرار و رَم" کی۔

۲ - چوتھے شعر کو ملاحظہ کیجئے - اول تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ "جانی پہچانی حدوں" سے کیا مراد ہے، اگر اس سے ذہنِ عرب اور فکرِ عجم مراد ہے جس کا ذکر دوسرے مصرعہ میں کیا گیا ہے تو یہ عرب و عجم کی ترقیوں کا کھُلا ہوا انکار ہے، اور پتہ نہیں چلتا کہ ان کی حدوں سے آگے وہ کون سا مقام ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سیماب صاحب کا مقصود مغربی ترقی تو ہوگی نہیں، پھر جب عرب عجم اور مغرب میں سے کسی جگہ کی ترقی ان کو پسند نہیں تو وہ کونسی دوسری منزل ہے جس طرف وہ لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ تو ہوا معنوی نقص۔ دوسرا نقص فنی حیثیت سے یہ ہے کہ قلعۂ ذہنِ عرب پھاندنا تو ٹھیک ہے، لیکن فکرِ عجم پھاندنا کیا ؟ فکر کوئی ایسی چیز نہیں جس کو پھاندا جائے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فکرِ عجم سے پہلے قلعہ کا لفظ محذوف ہے تو بھی صحیح نہیں کیونکہ اس صورت میں فکرِ عجم سے پہلے واوِ عاطفہ کا آنا ضروری تھا۔

۳ - پانچویں شعر کا پہلا مصرعہ ہے :-

مسلکِ موجود کی تجدید کرنا ہے تجھے

تجدید کسی ایسی چیز کی ہوتی ہے جو پہلے تھی اور اب نہیں ہے، پھر جب ایک مسلک موجود ہے تو اس کی تجدید کیا معنی ہیں تائید کہتے تو بیشک درست تھا۔

دوسرے مصرعہ میں عنوان کا لفظ بے محل استعمال کیا گیا ہے۔ عنوان، دیباچہ اور سرنامہ کو کہتے ہیں۔ تاریخِ امم کے دیباچہ کا فرسودہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کی جگہ آئین لکھتے تو زیادہ مناسب تھا۔

علاوہ اس کے تاریخِ اُمم کو فرسودہ کہنے کے یہ معنی ہیں کہ شاعر اُن کو اب بیکار سمجھتا ہے حالانکہ تاریخِ اُمم میں مسلمانوں کی تاریخ بھی شامل ہے، تو کیا سیماب صاحب اسے بھی فرسودہ سمجھتے ہیں۔ علاوہ بریں اس سے قبل وہ تیسرے شعر میں منزل تک پہونچنے کے لئے اسلاف ہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت کرتے ہیں، یہ تضاد کیسا ؟

۴ - ساتویں شعر میں، چشمِ سرمگیں، محض غزالِ صحرائی کی رعایت سے لایا گیا ہے، اور ماہنامہ غزال سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

آٹھویں شعر میں آوارگانِ دشت میں نغمۂ تہذیب چھیڑنے کی ہدایت کی جاتی ہے، حالانکہ ان کو ضرورت نغمۂ تنظیم کی ہے دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ سے بے تعلق ہے، کیونکہ جب تک آئینِ نو کی صراحت نہ ہو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ خاطرِ صیاد پر اس کا ارتسام آوارگانِ دشت کے لئے کس طرح مفید ہو سکتا ہے۔

پہلے مصرعہ میں خلوت نشینی چھوڑ دینے کی ہدایت کس کو کی گئی ہے ؟ غزالِ صحرا کو ؟ یا ماہنامہ غزال کے اڈیٹر کو ؟ -

پھر مدیر غزال کی خلوت نشینی کا حال تو معلوم نہیں، لیکن غزالِ صحرا تو یقیناً خلوت نشین نہیں ہوتا۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں ایک اعلان کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے، اور خلوت نشینی اعلان کے مانع نہیں۔ اگر خامُش نشینی کہا جاتا تو بیشک دونوں مصرعوں میں تعلق پیدا ہو سکتا تھا۔

۷۔ نویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ نَصَب بہ فتحتین استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ اس کا صحیح تلفظ نَصْب بہ سکون صاد ہے۔

۸۔ تیرھویں شعر میں دشت کے ساتھ دمن کا لفظ شاید کہسار کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ جو صحیح نہیں۔ راجہ نل کی بیوی کا نام تو بیشک دمن تھا، لیکن یوں اس کے کوئی معنی نہیں۔ فارسی میں ضرورت شعری کے لحاظ سے دامن کا مخفف کبھی کبھی دمن استعمال ہوتا ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ کوہ و دمن لکھ کر کوہ و دامنِ کوہ مراد لیں، لیکن تنہا دمن کوئی لفظ نہیں ہے۔ دِمَن جمع ہے دمان کی اور عربی میں دِمَن، کھاد کو کہتے ہیں۔ — دمن کی جگہ وہ جبل بھی لکھ سکتے تھے، جو بالکل سامنے کا لفظ تھا۔ دوسری غلطی قافیہ کی ہے "منقسَم" بہ فتح سین غلطی ہے۔ انقسام کے معنے تقسیم ہونے کے ہیں نہ کہ تقسیم کرنے کے، جو معنی سیماب صاحب کے سامنے ہیں وہ "منقسِم" (اسم فاعل) سے پورے ہوتے ہیں۔ بابِ انفعال کا اسم مفعول مستعمل نہیں۔

۹۔ آخری شعر بہت عجیب و غریب ہے، علی الخصوص دوسرا مصرعہ پڑھ کر تو کایستھوں کی فارسی سامنے آجاتی ہے — ارتقائی کارنامے — ہو تجھے بالیدگی؟ — پیشِ غزالانِ حرم — تینوں ٹکڑے ایک نومشق شاعر کے کلام میں ہوتے تو خیر قابل درگزر تھے، لیکن سیماب ایسا کہنہ مشق استاد ان کی سخافت پر غور نہ کرے، حیرت ہے — یہ شعر یوں بھی ہو سکتا تھا:-

تاکہ تیری ارتقاء کے کارنامے دیکھ کر
سر جھکا دیں سامنے تیرے غزالانِ حرم

جوش - جگر - سیماب - ماہر وغیرہ بڑے مشہور شاعر ہیں

لیکن خود انھیں بھی پتہ نہیں چلتا کہ کبھی کبھی وہ کیسی فاش غلطیاں کر جاتے ہیں۔ زبان کی غلطی، بیان کی غلطی، فارسی تراکیب کی غلطی عروض و قوافی کی غلطی، لغت کی۔ حضرت نیاز نے انھیں مشہور شاعروں کی بعض نظموں اور غزلوں پر تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ بڑے سے بڑا شاعر بھی اپنی رو میں بعض ایسی غلطیاں کر جاتا ہے، جو اسے نہ کرنا چاہئے۔ ہر چند ان غلطیوں سے شاعر کی شاعرانہ اہلیت پر کوئی حرف نہیں آتا، لیکن پاکیزہ ذوق جو صرف "مے بے درد" کا عادی ہے، ضرور ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اور اسی "چینِ جبیں" کا نام ہے:

"مالہ وماعلیہ" — گرد پوش رنگین - قیمت دو روپیہ - منیجر نگار

ابر و باد

یہ بادلوں کا تنفس، یہ سرد سرد بہار
یہ سنسناتی ہوائیں، یہ بولتے ہوئے ساز!
کسے خبر تھی کہ تجھ کو پکارتے اے دوست
انہی فضاؤں میں کھو جائے گی مری آواز!

کسے خبر کہ اسی رنگ و بو کے طوفاں میں — گل و سمن کے تبسم بھی ڈوب جائیں گے
تھپک کے جن کو سلائے گی رات بھر شبنم — وہ غنچے صبح کی لو سے بھی کپکپائیں گے

تجھے بھی یاد ہے اِن بدلیوں کے سائے میں
تری نگاہ سے ٹوٹے ہیں کتنے پیمانے!
مگر یہ کون اُٹھا آج تیری محفل سے
سلگ رہے ہیں چراغوں سے دور پروانے!!

سمجھ سکے تو سمجھ کن "سیاہیوں" کے حضور — کیا گیا ہے "مہ و آفتاب" سے انکار،
لیا ہے کتنے "بہشتوں" سے انتقام نہ پوچھ — "گلوں" کے دام خریدے گئے ہیں "برق و شرار"!

کراہتے رہے راہی، پکارتے رہے "خضر"
مگر ٹھہر نہ سکا کاروانِ نجم و قمر،
زمیں پہ آدم و حوّا کے خون کا ماتم،
مگر افق کی جبیں پر وہی ہے نورِ سحر!!

کہا ہے کتنی نگاہوں نے فی امان اللہ! — ہوئے ہیں ساکت و مبہوت کتنے بام و در!
اُٹھے ہیں بہرِ دعا آہ کتنے کانپتے ہاتھ — کس اہتمام سے باندھا گیا ہے رختِ سفر!!

کسے خبر مری غربت مجھے کہاں لے جائے
ترا دیار مرے راستے میں آئے نہ آئے!
مری نگاہ میں رقصاں ہیں سیکڑوں طوفاں
مگر خدا نہ کرے کوئی موج تجھ کو جگائے!!

غموں کی دھوپ سے رکھے تجھے خدا محفوظ، — غبارِ وقت سے میلا ترا شباب نہ ہو!
کسی ملال کی بے نجم و ماہ راتوں میں — غروب تیری جوانی کا آفتاب نہ ہو!!

طوفان

جذب کر سکتا نہیں مجھ کو فنا رازِ حیات
رونما ہے اب مرے آگے ضمیرِ کائنات

جس کے سینے پر گڑے ہوں یاس و حرماں کے علم
وہ ستاروں کی طرف کیونکر اُٹھائے گا قدم

چھپ گیا اے ہمنشیں انسانیت کا آفتاب
اب رُخِ احساس و عصمت ہے نقاب اندر نقاب

اسود و احمر کی دیواروں میں ہے فطرت اسیر
کھو گیا شورِ فنا میں کیفِ طاؤس و نفیر،

خاک بر سر ہے جمالِ سلسبیل و نیل و طور
روحِ آدم جھک رہی ہے پھر مشیت کے حضور

شورشِ دیر و حرم، ہنگامۂ کفر و یقیں
ہوگئے کتنے ہلال و مہر پیوندِ زمیں،

تھرتھرائے جام و مینا، کانپ اُٹھے ساز و ایاغ
جھلملائیں کتنی شمعیں، بجھ گئے کتنے چراغ

سطوتِ آفاق لرزاں، سم فشاں موجِ نسیم
ماہ و اختر پارہ پارہ، گلبن و صحرا دو نیم،

کس قدر لاشیں پڑی سڑتی ہیں بے گور و کفن
"فتنۂ شب" سے ہے سنولائی ہوئی صبحِ وطن

چھا گئے ہیں نغمۂ ہستی پہ ویرانی کے راگ
اب نہ وہ آنکھوں کے پیمانے نہ رخساروں کی آگ

عالمِ اسباب پر ہے تیرگی چھائی ہوئی
زندگی مجھ کو نظر آتی ہے گھبرائی ہوئی

پھر جہاں معمور ہوگا مستیِ کردار سے
گونج اُٹھیں گے مے کدے تلوار کی جھنکار سے

شعلہ زن ہوں گے پیالے، ٹوٹ جائیں گے سبو
دیکھو مستقبل کے ماتھے سے ٹپکتا ہے لہو

کربلا انداز ہے پھر شورِ زارِ آب و گِل
یہ طلسماتِ منظم - یہ سدابِ مستقل

نکبت و بے مائیگی کو دینے والی ہے خراج
صولتِ قارون و سنجر، عظمتِ اہرام و تاج

جاں بہ لب کلیوں کے دامن خون سے گلنار ہیں
پھر فضا میں اک نئے طوفان کے آثار ہیں

سینۂ گیتی پہ یہ طوفان جب لہرائے گا
عرش و امکاں کا تجمل خاک میں مل جائے گا!!

افسر سیمابی احمد نگری

درد سعیدی :-

گوش برآواز ہیں یوں تو زمان و مکاں،
سُن بھی سکیگا مگر کوئی مری داستاں ؟

آئی، وہ آئی نظر منزلِ تسکینِ جاں !
اور بس اک دو قدم لے مری عمرِ رواں !

کیسے فراموش ہوں دل سے نقوشِ الم
قصۂ ماضی نہیں کوئی مری داستاں

یوں متزلزل ابھی دل میں ہے بنیادِ غم
جیسے ہو باقی کوئی حادثۂ ناگہاں،

اے دلِ نافہم ہے یہ بھی فریبِ امید !
حدِ نظر کے سوا کچھ بھی نہیں آسماں

دل کو سکوں مل گیا یاس کی آغوش میں،
کام مرے آگیا میرا غمِ رائیگاں

مدتوں سمجھا کیا اپنا غمِ دل جسے
آج وہ ثابت ہوا دردِ غمِ دیگراں

عرشی بھوپالی :-

غمِ حیات کا کوئی فریب کھا نہ سکے
ہم ان کی یاد کو دل سے کبھی بھلا نہ سکے

وہ آئے سامنے لیکن نظر ملا نہ سکے
مری نگاہِ تمنا کی تاب لا نہ سکے

رہِ وفا کی کٹھن منزلیں ارے توبہ
وہ تھوڑی دور بھی ہمراہ میرے آ نہ سکے

زمانہ کہتا ہے برباد آرزو مجھکو
خدا کرے کوئی الزام ان پہ آ نہ سکے

نہ جانے ٹوٹ پڑیں کیا قیامتیں دل پر
ہم آج شدتِ غم میں بھی مسکرا نہ سکے

تری حیات سکوں آشنا سے کیا حاصل
وہ نقش چھوڑ زمانہ جسے مٹا نہ سکے

نہ کہتے تھے کہ ہے بے سود ان سے عرضِ الم
جبیں پہ چند ستارے بھی جھلملا نہ سکے

تری نوازشِ بیحد کا شکریہ لیکن
وہ کیا کرے جسے قربت بھی راس آ نہ سکے

نہ پوچھ اس کی تباہی جو سامنے اُن کے
چھپائے رازِ الم اور مسکرا نہ سکے

غمِ حیات کے یہ سخت مرحلے توبہ
کبھی کبھی تو مجھے وہ بھی یاد آ نہ سکے

کسی طرح اُسے جینے کا حق نہیں عرشی
جو اپنے آنسوؤں میں خونِ دل ملا نہ سکے

انیس و دبیر کا فرق

مرثیہ کی اقلیم پر تنہا میر انیس ہی قابض نہیں ہیں۔ مرزا دبیر بھی اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں بلکہ اگر مرثیہ کی ضروریات اور اس کے صفات کا الگ الگ جایزہ لیا جائے تو بعض باتوں میں وہ میر انیس سے آگے ہیں، ظاہر ہے کہ دونوں کا مقصد ایک تھا، دونوں کو مرثیہ نگاری کی روایات پورے طور پر ملی تھیں۔ دونوں نے اپنے اپنے طریقہ پر اس کو صاف و خوبصورت بنا کر پیش کیا، دونوں کے نزدیک مرثیہ کے معنے مدح سرائی کے تھے، دونوں نے اپنی اپنی طرح پر امام علیہ السلام اور ان کے انصار کی مدح کی ہے، دونوں نے رُلانے کے لئے لکھنؤ کے رسم و رواج و ادب، تہذیب کو امام علیہ السلام سے منسوب کیا۔ دونوں نے رزم نگاری کے پرانے اصولوں پر عمل کیا، دونوں نے اپنی اپنی طرح پر مرثیہ کی صنف کو عروج دیا اور دونوں ایک دوسرے کی اہمیت کے قایل تھے۔

مگر دونوں کی انفرادیت جدا تھی۔ دونوں کی طبیعت کا رجحان مختلف تھا۔ مرزا صاحب میں اگر ایک طرف بلند پروازی کرتے ہوئے حقیقت سے بہت زیادہ دور نکل جانے کی صلاحیت تھی تو دوسری طرف باریکیوں کی تہ تک پہونچ جانے کی بھی زبردست قوت تھی۔ برخلاف اس کے میر صاحب نہ حقیقت سے بہت اونچے اُڑتے تھے اور نہ زیادہ گہرائیوں ہی میں جانے کی زحمت کرتے تھے۔ ان کی فطرت ان کو ایک خاص سطح پر رکھتی تھی اور یہی ان کی انفرادی خصوصیت ہے۔ مرزا دبیر کی تخئیل مکمل قصیدہ گو کی تخئیل ہے اور مبالغہ آمیزی و معنی آفرینی میں وہ سوداؔ سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ میر انیس کی تخئیل مثنوی نگار کی تخئیل ہے اور وہ میر حسنؔ کی راہ پر چل کر اس کو زیادہ مکمل کر دیتے ہیں۔ مدح سرائی میں مرزا صاحب، میر صاحب سے کہیں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ میر صاحب کی مدحوں میں بھی بعض جگہ مرزا صاحب کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش صاف ظاہر ہوتی ہے، مگر وہ رنگ انکی طبیعت کے منافی ہے اس لئے جم نہیں پاتا۔ وہ اپنے خاندانی مداح حسین ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ کفِ خاک سے نورِ خدا کی مدح نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ اس باب میں اپنے حریف سے پیچھے رہ جاتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ بھی احساس تھا کہ ان کا فن مرقع نگاری ہے اور وہ اس پر ناز کرتے ہیں کہ "رزم کا میدان دکھاتے ہیں اور بزم کا راگ جانتے ہیں وہ سب سے آگے ہیں۔ ان کے مرقعے ایسے پر اثر ہیں کہ مانے اور بہزاد ان سے خار کھائیں اور نقش ارژنگ اس کے سامنے کارائی لکیریں نظر آئے" الغرض مرثیہ کے دو خاص پہلوؤں میں دونوں کو کمال حاصل ہے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیجا سکتی مگر دونوں کا رنگ مختلف ہے۔ مرزا دبیر کی زبان عالموں کی زبان ہے اور ہر ہر قدم پر تلمیحات و کنایات سے پُر ہے۔ میر انیس کی زبان شرفا کی عام فہم اور سلیس زبان ہے مرزا دبیر زود گو اور بے پروا شاعر تھے اور اپنی تصنیف پر نظر ثانی بھی بہت کم کرتے تھے، میر انیس اپنے ہر ہر مصرع کی نوک پلک درست کرنے میں کافی محنت کرتے تھے۔ مرزا دبیر کا رنگ مردانہ ہے اور اس میں ایک خاص زور و شکوہ ہے۔ برخلاف اسکے میر صاحب کا رنگ نسائیت میں ڈوبا ہوا ہے اور اس کا لہجہ بالکل وہی ہے جو بیگموں کی بات چیت کا ہوتا ہے۔

میر انیس کے زمانہ میں میر صاحب کا رنگ کمال فصاحت اور مرزا صاحب کا رنگ کمال بلاغت خیال کیا جاتا تھا اور

اب بھی عام طور پر لکھنؤ کے شریف خاندانوں کی یہی رائے ہے۔ اس رائے کے غلط ہونے پر مولانا شبلی نے کافی روشنی ڈالی ہے اور ان کی اس رائے سے اختلاف کرنا مشکل ہے۔ مگر مولانا کا موازنۂ انیس و دبیر ایک عجیب قسم کی تنقید ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حالی کی طرح وہ بھی انگریزی تنقید کے مبہم اثر کے تحت انیسویں صدی کی انگریزی شاعری کی ایک وقتی مقبول ہونے والی نیچرل شاعری ہی کو شاعری سمجھتے ہیں اور اسکے خلاف جو چیز ہے اس کو بیکار جانتے ہیں مگر بیسویں صدی میں یہ نظریہ بدل گیا میر انیس کی شاعری کو تو Tennyson کی شاعری کا مذاق رکھنے والے سراہیں گے لیکن بیسویں صدی کا خاص مذاق رکھنے والا مرزا دبیر ہی کو میر انیس پر ترجیح دے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ دونوں کا مذاق الگ الگ ہے اور اگر ایک شاعر ایک صفت میں اپنی انفرادیت نہایت زور کے ساتھ نمایاں کر سکا ہے تو دوسرا دوسری صفت میں اسی زور کے ساتھ اپنی انفرادیت ظاہر کرتا ہے، مولانا شبلی نے اپنے موازنہ سے اُردو تنقید میں بڑی غلط راہ پیدا کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص اپنے پسندیدہ شاعر کو ہر دوسرے شاعر سے مقابلتاً پیش کر کے ایک کو بڑھانے اور دوسرے کو گرانے لگا۔ اسی قسم کی وہ نقاد بھی ہیں جو شیکسپیر اور میر انیس ایسے مختلف الروایات شعراء کا مقابلہ کرتے ہیں، تاہم شبلی کا موازنہ اس درجہ غلط فہمی تو نہیں ہے۔ کیونکہ دُنیا میں اگر کسی دو شاعروں کا مقابلہ اور موازنہ ہوسکتا ہے تو وہ انیس و دبیر ہی ہیں، مگر اس قسم کی مثالیں جن میں ان کے حسب ذیل ہم مضمون مصرعوں کو لیکر ایک کو بامحل اور دوسرے کو بے محل کہا گیا ہے بالکل برداشت سے باہر ہیں۔

انیس :- مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

دبیر :- بولے کہ میں حسین علیہ السلام ہوں

نفسیاتی نقطۂ نظر سے دونوں مصرعے اس موقع پر موزوں ہوسکتے ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ امام نے اسوقت اپنے انکسار کو واضح کرنا ضروری سمجھا تھا یا اپنی شان کو۔ میر انیس کی رائے یہ ہے کہ حضرت نے انکسار سے کام لیا اور مرزا دبیر کا تصور ہے کہ حضرت نے اپنے شان و عظمت کی طرف اشارہ کیا۔ یہ دونوں رائیں دونوں شاعروں کی مختلف فطرتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مرزا دبیر کی مردانہ طبیعت اس موقعہ پر امام حسین کا تصور میر انیس کی طرح نہیں کرسکتی۔

مولانا شبلی کے مقلدین میر انیس کو مرزا دبیر پر اس لئے بھی ترجیح دیتے ہیں کہ میر انیس کے یہاں صحیح نفسیات نگاری ملتی ہے اور مرزا صاحب کے یہاں نہیں ملتی۔ حالانکہ نہ میر انیس کی شاعری نفسیاتی ہے اور نہ مرزا دبیر کی، ہاں جہاں تک زبان اور رنگ کا تعلق ہے مرزا دبیر کا رنگ ایپک شاعروں کے عالمانہ اور پرشکوہ رنگ سے بہت کچھ مشابہ ہے اور اس معنے میں وہ میر صاحب پر سبقت لے جاتے ہیں۔ لیکن میر انیس اپنے سلیس اور نیچرل رنگ میں جو ڈرامہ سے قریب تر ہے۔ مرزا دبیر سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اُردو ادب کے جدید متعلم کی نگاہ مرزا دبیر سے زیادہ میر انیس کی طرف جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میر انیس کی فطرت نے آنے والے زمانہ کے رنگ کو مرزا دبیر سے زیادہ قبول کیا تھا۔ دونوں بحرانی دور کے شاعر تھے

مگر مرزا دبیر اردو شاعری کی عام روایات کو پیکر آگے نہ بڑھ سکے۔ اور میر صاحب نے اپنے احتساسی رجحان کی مدد سے خوش بیانی و محاکات کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔

اردو شاعروں میں انیس کا مقام

اردو کی اقلیم سخن میں مرثیہ اس اقلیم کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میر انیس صرف مرثیہ کے بادشاہ تھے یا پوری اقلیم سخن کے؟ اردو کے شعراء میں ولی، میر، سودا، میر حسن، غالب اور ذوق، مصحفی اور انشا، آتش و ناسخ، انیس و دبیر، داغ، حالی اور اقبال کو قدر اول کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اور انھیں کو سامنے رکھ کر ہمیں انیس کا درجہ متعین کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ان شاعروں کا چار دائروں میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ ایک دائرہ غزل گو شاعروں کا ہے جس میں ولی، میر اور آتش آتے ہیں اور میر سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ مرثیوں میں تغزل کی نہ گنجایش تھی۔ لہذا میر انیس کا ان سے مقابلہ کرنا عبث ہے۔

دوسرا دائرہ قصیدہ گویوں کا ہے جس میں سودا اور ذوق ممتاز ہیں۔ مرثیہ پر قصیدہ کا اثر بہت ہے اس لئے ایک حد تک مرثیہ گو شاعر بھی اس دائرے میں لائے جا سکتے ہیں۔ مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ مداحی کے باب میں مرزا دبیر بہ نسبت میر کے سودا سے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے اس قسم کی شاعری میں بھی انیس کو کوئی بڑا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا۔

تیسرا دائرہ افسانوی اور بیانیہ شاعری کا ہے۔ مرثیوں میں افسانہ بیان کرنے کی گنجایش ہی نہ تھی اور اس کی وہ خصوصیت جسے Suspense کہتے ہیں مرثیوں میں پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ مرثیہ کا انجام ہر شخص کو معلوم تھا اور اس لئے افسانوی دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں افسانوی شاعری کی وہ خصوصیت جس کا تعلق بیان سے ہے اس کی بیشک مرثیہ میں کافی گنجایش تھی اور اس کے لئے میر انیس کی فطرت خاص طور پر موزوں تھی۔ چنانچہ اس خصوصیت میں وہ میر حسن سے بھی بڑھ گئے ہیں۔

چوتھا دائرہ فلسفیانہ یا مفکرانہ شاعری کا ہے۔ اس میں غالب اور اقبال سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ مرثیہ میں نہ فکری پہلو کی گنجایش تھی اور نہ میر انیس کوئی مفکر شاعر تھے۔ ان کی شاعری جہانِ رنگ و بو تو ہے لیکن ہم کو کسی نئی ذہنی کائنات کی طرف نہیں لے جاتی۔

مرثیہ کی اس خصوصیت کے لحاظ سے کہ اس میں رزمیہ اور بیانیہ شاعری ایک نئے طریقہ پر تجلی ہوتی ہے ہم اس کو اردو کی طبعزاد اور غیر تقلیدی صنف کہتے ہیں جس میں میر انیس نے بڑی ترقی کی۔ الغرض اردو کی دنیائے شاعری میں میر، سودا، میر حسن، غالب اور میر انیس پانچ سب سے بڑے شاعر ٹھہرتے ہیں اور ان میں کسی کو کسی پر ترجیح دینا مشکل ہے۔ پھر چونکہ میر حسن اور سودا کو ایک حد تک اس بنا پر کچھ نیچا درجہ دیا جا سکتا ہے کہ ان کے فن اب فرسودہ سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے تین بہترین شاعر میر، غالب اور انیس ہیں۔ ان میں غالب کو الگ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ در اصل وہ اردو کے نہیں بلکہ فارسی کے شاعر ہیں۔

ایک بات اور ہے وہ یہ کہ لفظ "سخن" ہمارے یہاں ادب کے ہم معنے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن میر انیس نے ادب کی جگہ سخن ہی استعمال کیا ہے اور اقلیم سخن کی بادشاہت سے انکا یہی مقصد ہو سکتا ہے کہ وہ اُردو کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ ہمارا قدیم شاعر اپنے آپ کو ادیب نہیں کہتا تھا بلکہ اہلِ سخن کہا کرتا تھا۔ "سخن" کے استعمال پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے ادب کا ایک ہی پہلو مراد ہوتا تھا، جسے ہم آجکل طرزِ ادا کہتے ہیں اور جس میں زبان کا صحیح استعمال، فصاحت و بلاغت کے اصولوں کی پابندی، بیان و بدیع کو خوبصورتی کے ساتھ برتنا، بحروں کی روانی اور ترنم سب چیزیں شامل ہیں۔ ہر چند دہلی کے شعرا خیالات پر بہت زور دیتے تھے اور لکھنؤ کے شعراء طرزِ ادا پر، مگر ہم کو بڑے شاعروں میں یہ دو اسکول الگ الگ نظر نہیں آتے۔ ذوق بالکل لکھنؤ اسکول کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور آتش لکھنؤ کے بالکل دہلی اسکول کے خیالات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اُردو میں عام طور پر ادب کے معنے سخن ہی سمجھے جاتے ہیں اور زبان کی خوبیوں کے علاوہ دوسری صفات کی بنا پر کسی تصنیف کو ادب میں داخل نہیں کیا جاتا۔ اس لئے عام اُردو سخن شناس اور طالب ادب کے نزدیک وہی شاعر سب سے اچھا ٹھہرتا ہے جس نے زبان کا استعمال سب سے زیادہ خوبی کے ساتھ کیا ہو اور اس باب میں انیس کا تفوق ظاہر ہے۔

انیس اور دُنیا کے شاعر

میر انیس کو اُردو شاعروں میں سب سے زیادہ ممتاز ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ان کو دنیا کے بڑے شاعروں میں بھی کوئی جگہ مل سکتی ہے؟

دُنیا میں شاعری کے چار دھارے نظر آتے ہیں۔ ایک دھارا چینی شاعری کا ہے جو چین، جاپان اور تمام مشرق بعید میں دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس شاعری کی زبان بہت ہی پرانے قسم کی زبان ہے اور اس کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہوا جو دُنیا بھر میں مقبول ہوا ہو۔

دوسرا دھارا سنسکرت شاعری کا ہے جس کے اثر سے ہندوستان کی تمام موجودہ زبانوں کی شاعری مرعوب ہوئی۔ سنسکرت میں مہابھارت اور رامائن کی طویل نظمیں آفاقی حیثیت رکھتی ہیں اور شاعروں میں کالیداس ایک ایسی ہستی ہے جو دنیا کے شاعروں میں اپنے لئے ایک جگہ بنا چکی ہے۔

تیسرا دھارا یورپ کی شاعری کا ہے۔ یہ شاعری یونان سے شروع ہوتی ہے۔ ہومر دُنیا کا سب سے پہلا بڑا شاعر ہے۔ ہومر کی نظم ایپک ہے مگر یونانی شاعر زیادہ تر ٹریجڈی نگار سب سے زیادہ اہم ہیں۔ ایسچیلس Aeschylus سوفوکلیس Sopucles یوری پیڈیز Euripidius ایسے شاعر ہیں جنھوں نے تمام یورپ پر اثر ڈالا۔ پھر اٹلی کی شاعری آتی ہے (پہلے لاطینی اور پھر اطالوی)۔ یہاں ایک شاعری بہت ہی نمایاں حیثیت رکھتی ہے اور دو شاعر ایک ورجل اور دوسرا دانتے دُنیا کے بڑے شاعروں میں گنے جاتے ہیں۔ جدید یورپی زبانوں میں فرانس کے آفاقی ادیب تمام تر نثر نگار ہیں۔ پرتگالی زبان نے ایک آفاقی شاعر کیموئس پیدا کیا۔ جرمنی کا شاعر گوئٹے ہر معنی میں آفاقی ہے۔ یورپ کے ادب میں

شاعری کے لئے سب سے زیادہ نمایاں ملک انگلستان ہے۔ یہاں کا چاسر Chaucer افسانوی شاعری میں۔ اسپنسر Spenser بیانیہ شاعری میں۔ شیکسپیر Shakespeare ڈرامائی شاعری میں اور ملٹن Milton ایپک شاعری میں تمام یورپ میں سب سے آگے سمجھے جاتے ہیں۔

چوتھا دھارا عربی، فارسی اور اُردو شاعری کا ہے۔ یہ شاعری عرب سے شروع ہوتی ہے۔ اس کی ممتاز صنف قصیدہ اور غزل ہے۔ عرب میں انھیں دونوں قسم کی شاعری کا رواج رہا مگر وہاں کوئی ایسا بڑا شاعر نہیں ہوا جس کو آفاقی شہرت حاصل ہو۔ فارسی شاعری عربی کی تقلید سے بڑھی۔ مداحیہ شاعری میں خاقانی اور انوری نے عروج حاصل کیا۔ غزل میں سعدی اور حافظ مشہور ہوئے۔ فارسی میں ایک اور صنف مثنوی کا اضافہ ہوا اور اس میں شاہ نامہ اور مولانا روم کی فلسفیانہ مثنوی معنوی نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ اور فردوسی، سعدی، حافظ اور مولانا روم کو دُنیا کے شاعروں میں جگہ مل چکی ہے۔ اسی شاعری سے اُردو شاعری متاثر ہوئی جو مدحیہ، بیانیہ اور غنائی شاعری پر مشتمل ہے۔ یورپ کی شاعری میں بھی تین قسم کی شاعری نظر آتی ہے ایک ڈرامائی۔ دوسری ایپک اور تیسری غنائی۔ بعض لوگ غلط فہمی سے مدحیہ اور ایپک کا مقابلہ کرتے ہیں اور بعض بیانیہ شاعری اور ڈرامہ کا۔ ہاں لیرک شاعری ضرور دونوں جگہ پائی جاتی ہے۔ مگر یورپ میں لیرک نگار کوئی اتنا بڑا نہیں ہوا جیسے حافظ، البتہ ڈرامائی شاعری میں شیکسپیر بہت بلند درجہ رکھتا ہے۔ اُردو کے شعرا میں صرف غالب اپنی انفرادیت اور معنویت کی بنا پر دُنیا میں مشہور ہو سکے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میر انیس کو بھی دُنیا کے بڑے شاعروں میں جگہ ملنے کا حق حاصل ہے؟

اس میں شک نہیں بیانیہ شاعری میں انیس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ مگر ان کی شاعری میں ایک بہت بڑی کمی ہے جو انھیں آفاقی شاعروں کے دائرے سے باہر کر دیتی ہے اور اس کمی کا تعلق صنف مرثیہ کی تنگ دامانی ہے۔ مرثیہ ایک خاص قوم کے مذہبی معتقدات سے متعلق ہے اس لئے اس میں کوئی آفاقیت پیدا ہو ہی نہیں سکی، ہاں لطف زبان و بیان ضرور ہے، لیکن اگر مراثی انیس کا کسی غیر زبان میں ترجمہ کیا جائے تو یہ لطف بھی باقی نہیں رہے گا۔ دوسری کمی یہ ہے کہ میر انیس کے یہاں فکری پہلو بہت کمزور ہے۔ وہ شعرا جن کو آفاقی حیثیت دی جاتی ہے ان میں تخیلی پہلو کے ساتھ ساتھ فکری پہلو بھی اعلیٰ پایہ کا ملتا ہے۔ لیکن میر انیس کے یہاں نہ کوئی بلند خیال پایا جاتا ہے، نہ کسی کردار کی مکمل تخلیق۔ صرف زبان ہی زبان ہے اور اس کی قدر وہ لوگ کیا کر سکتے ہیں جو ان کی زبان سے پورے طور پر واقف نہ ہوں۔ اس لئے میر انیس کو دنیا کے بڑے شاعروں میں جگہ نہیں مل سکتی۔ وہ اچھے شاعر ضرور ہیں لیکن بڑے نہیں۔

میر انیس کی شاعری میں زندگی کے نقوش

بنیادی طور پر مرثیہ میں زندگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے واقعہ کربلا کے سلسلہ میں مرثیہ نگاروں نے صرف چار باتوں پر زور دیا ہے، ایک وطن یا عزیزوں سے جدائی۔ دوسری کچھ افراد کی باہم گفتگو، تیسری معرکہ جنگ کے حالات اور

چوتھے کچھ لوگوں کا مصائب میں مبتلا ہو کر گریہ وزاری کرنا - ظاہر ہے کہ جو صنف ان چار حالتوں میں محدود ہو اس میں زندگی کے کتنے حالات آسکتے ہیں -

قدرتی طور پر جو شخص مرثیوں کو پڑھے گا وہ یہ بھی چاہے گا کہ امام علیہ السلام کی زندگی کے کچھ حالات اس کو معلوم ہوں مگر مرثیوں میں زندگی کے صرف وہ جزئیات ملتے ہیں جو لکھنوی رسم و رواج سے وابستہ ہیں اور عرب یا امام حسینؑ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے -

مولانا شبلی نے اس بات کی یہ تاویل کی ہے کہ شاعر مورخ نہیں ہوتا ہے لہذا جو چاہے سو کہے مگر یہ مولانا شبلی کا مغالطہ ہے - شاعر کو تاریخی حقیقت سے کوئی سروکار نہیں مگر اس کو شاعرانہ حقیقت سے تو سروکار ہوتا ہے - تاریخی اعتبار سے نہ سہی مگر تخئیلی اعتبار سے تو اسے صحیح تصور قایم کرنا چاہئے - اگر کوئی شخص کوئی ایسی تصنیف کر رہا ہے جس کا ماحول پرانے یونان کی زندگی ہے، تو وہ افراد کو ہوائی جہاز پر سفر کرتا ہوا یا سوڈا واٹر پیتا ہوا تو نہ دکھائے گا - لیکن حقیقت یہ ہے کہ انیس کو زندگی کے نقوش ظاہر کرنے سے سروکار ہی نہ تھا - ان کا یہ مقصد ہی نہ تھا کہ امامؑ کی زندگی کے بابت کوئی صحیح تصور پیش کریں - ان کی غرض صرف یہ تھی کہ لوگوں کو رُلائیں اور اس کے لئے لکھنؤ کی زندگی کو پیش کرنا بہت ضروری تھا تاکہ سننے والے خود اپنے ماحول کو سامنے رکھ کر متاثر ہوں - لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مرثیوں میں ہم کو لکھنوی سوسائٹی کا بھی مکمل نقشہ نہیں ملتا اور نہ یہاں کی سوسائٹی کے کسی پہلو پر ان سے روشنی پڑتی ہے - ہاں، حفظ مراتب کے لحاظ سے یہاں کی بات چیت اور نازو شیون کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے - انیس کے مرثیوں میں ہم کو کوئی مکمل فرد بھی نہیں ملتا - انیس کی سراپا نگاری ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ہم افراد کو جان سکتے ہیں، لیکن اس کا یہ حال ہے کہ ایک ہی سراپا کو ہم تمام افراد پر منطبق کر سکتے ہیں - ان کی نفسیات نگاری کا یہ حال ہے کہ وہ یہ تو ضرور جانتے ہیں کہ غصہ میں آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور انکسار میں انسان سر جھکا کر بات کرتا ہے، عورتوں میں فطری شرم و حیا ہوتی ہے اور غم کے موقع پر ہر شخص بے اختیار رونے لگتا ہے، لیکن اس سے آگے وہ انفرادی نفسیات کو ہاتھ نہیں لگاتے اور اس لئے مکمل اور مربوط جیتے جاگتے افراد ہم کو ان کے یہاں نظر نہیں آتے - رہ گئی انسانی احساسات و جذبات کی عکاسی سو وہ بھی جذباتیت کے درجہ سے بلند نہیں ہے - صحیح جذبات نگاری کا مقصد جذبات کی اصلاح ہوتا ہے، لیکن میر انیس کے یہاں اس کا مقصد صرف گریہ و زاری ہے - اس لئے مراثی انیس کو ادب برائے زندگی کے دائرے میں لانا غلطی ہے -

کلام کی منزلت

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میر انیس کے کلام کی کیا قدر و قیمت ہے - ہم کو ایک گروہ ایسا نظر آتا ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے میر انیس کے لئے عرش پر ایک لاکھ چونسٹھ ہزار کنگرے طیار کئے ہیں اور اسلئے ان کو ہر طرح کامل سمجھنا اور ان کی شاعری میں دُنیا بھر کے محاسن تسلیم کرنا لازم ہے، لیکن اگر مذہبی غلو سے ہٹ کر فنی حیثیت سے کلام انیس کا مطالعہ کیا جائے تو ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ بڑے زبردست ماہر زبان تھے اور ایک مخصوص قسم کی بیانیہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے

ختم

مرثیہ نگاری اور میر انیس

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا لکھا ہوا

یہ مقالہ اس مہینے ختم ہو رہا ہے - اس کا سلسلہ اکتوبر ۴۸ء سے شروع ہوا تھا اور جنوری، فروری ۴۹ء کو چھوڑ کر تمام پرچوں میں برابر شایع ہوتا رہا۔ چونکہ ہر ماہ اس مقالہ کے چند کاغذ زاید چھپوا لئے گئے تھے، اس لئے جن صاحب کو پورا مقالہ شروع سے درکار ہو۔ وہ ایک روپیہ آٹھ آنے میں طلب کر سکتے ہیں۔ اسکے اجزاء علحدہ علحدہ نہیں مل سکتے۔

منیجر نگار

مذہب کے متعلق آپ کے دل میں بہت شکوک ہوں گے

آپ سوچتے ہوں گے کہ خدا کیا ہے، رسول کون ہو سکتا ہے، الہامی کتابوں کی کیا حقیقت ہے، دوزخ و جنت سے کیا مراد ہے، حشر و نشر کی کیا اصلیت ہے، عذاب و ثواب کا کیا مفہوم ہے، روح کسے کہتے ہیں۔ اسی طرح تمام عقاید مذہبی کے متعلق آپ کبھی نہ کبھی ضرور سوچتے ہوں گے اور جب آپ کسی نتیجہ تک نہ پہونچتے ہوں گے تو بڑی اُلجھن میں پڑ جاتے ہوں گے۔ پھر اگر آپ کو یہ اُلجھن دور کرنا ہے اور تعلیمات اسلام کی اصلی روح جاننا ہے تو "من ویزداں" کے دونوں حصے ملاحظہ فرمایئے۔ جو مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سال کی کاوش و تحقیق اور ۵۰ سال کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ مذہب و متعلقات مذہب سے واسطہ رکھنے والا کوئی سوال ایسا نہیں ہے جس کا جواب آپ کو ان کتابوں میں نہ ملے۔ اسکے علاوہ زور تحریر اور حسنِ بیان کے لحاظ سے بھی یہ اتنا بڑا ادبی کارنامہ ہے کہ اسکی مثال آپ کو کہیں اور مل ہی نہیں سکتی۔

"من ویزداں" حصۂ اول - ۶۷۲ صفحات مجلد معہ رنگین گردپوش، کاغذ سفید ۲۸ پونڈ

سات روپیہ آٹھ آنے

"من ویزداں" حصۂ دوم - مجلد - کاغذ سفید - ۲۴ پونڈ - پانچ روپیہ آٹھ آنے

دونوں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول بارہ روپیہ

منیجر نگار

جوش ملیح آبادی کی مشہور نظم حرفِ آخر

ابھی تک مکمل شایع نہیں ہوئی، لیکن اس کے مختلف اجزاء رسایل و جراید میں آ چکے ہیں اور اُن کے مطالعہ کے بعد ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ واقعی وہ جوش کے طنزیات کی آخری حد ہے، جس میں خدا سے خطاب کر کے انسان وہ سب کچھ کہہ گیا ہے جو عالمِ سرمستی میں کہہ سکتا ہے اس میں شک نہیں واقعی جوش کا حرفِ آخر ہے، لیکن اس کے جواب میں ایک دوسرے شاعر کا حرفِ آخر بھی سُن لیجئے:-

"قولِ فیصل"

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر، علی اختر اختر حیدر آبادی نے جوش کے تمام خیالات کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے، کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے، لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اسکو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ اس نظم میں جو ایک ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے، شیطان و شاعر کا مکالمہ کے ذریعہ سے رموزِ کائنات اور اسرارِ حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے رہی اسکی فنی حیثیت سو ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اختر کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ فنِ شعر میں اس سے زیادہ ترقی کی تمنا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔

معہ مقدمہ از نیاز فتحپوری -　　　کاغذ ۲۸ پونڈ دبیز، گرد پوش رنگین - قیمت دو روپیہ

شادی کے باب میں عمر کا تفاوت کتنا بڑا ظلم ہے

یہ ہے اصل مسئلہ جس پر جناب نظیر جمیلی ایم - اے نے اس کتاب میں قلم اُٹھایا ہے۔ یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے صوبۂ بہار کا اور ایسا دردناک واقعہ کہ کوئی اُسے فراموش کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک معمر شوہر کی جوان بیوی اور اسکے سوتیلے جوان لڑکے کی داستانِ معاشقہ ہے اور اس درجہ دلچسپ اندازِ بیان میں، پڑھنے والے پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اس ناول کی جان وہ خط ہے جو بیوی نے اعترافِ قصور میں اپنے شوہر کو لکھا ہے اور جس کو پڑھنے کے بعد بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

گوہر　　گوہر　　گوہر

قیمت ایک روپیہ

تین مقدس ہستیاں بے نقاب

ایک جید مولوی، ایک صاحبِ دل درویش، ایک مشہور ناظم یتیم خانہ - یہ ہیں تین مقدس ہستیاں جنکے چہرہ سے نقاب اُلٹ کر حضرت نیاز نے انکے صحیح خد و خال آپ کے سامنے پیش کئے ہیں۔ آپ پڑھ کر حیران رہ جائیں گے کہ کیا مذہب، تصوف و اخلاق کے پردے میں انسان اسقدر درندہ ہو جاتا ہے۔ یہ تینوں افسانے حضرت نیاز نے اپنی دورِ انشاپردازی کے اس دور میں لکھے جب انکا طنز اور مزاح اپنی پوری جوانی پر تھا۔ اگر آپ نے ابھی تک اس کا مطالعہ نہ کیا ہو تو اب ملاحظہ فرمایئے:- "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" - قیمت آٹھ آنے

مکتوبات نیاز (تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور لطیفیت کے لحاظ سے انشاء میں بالکل نئی چیزیں ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت حصہ اول و دوم فی حصہ تین روپیہ حصہ سوم چار روپیہ

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور ہندی کلام کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲- مادیین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت:- ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام زندہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے

قیمت:- ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے

قیمت حصہ اول [illegible] حصہ دوم [illegible]

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء
(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: حیاتِ مصحفی - اُردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء
(نظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: - نظیر کا مسلک - شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ -

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی -

قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول

جنوری، فروری، مارچ سنہ ۴۶ء

یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فنِ انتقاد پر ملک کے بہترین اہلِ قلم اور اربابِ فکر کے مضامین پر مشتمل ہے پہلا حصہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصہ میں فروری، مارچ دو مہینے شامل ہیں

قیمت ہر حصہ کی ایک روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجد و لیسی نمبر" ہے جس میں ایک مشہور فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے - ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا -

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جو بالا نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمتِ رفتہ اور تمدنِ اسلام کے بلند خصائص کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دورِ زرین کے ان کارناموں کو پیش نظر رکھیں جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی - قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین انتخاب کے شایع کئے گئے ہیں - اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہئے - قیمت دو روپیہ - علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرتِ اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۴۰۰ روپیہ	۲۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ - ششماہی جاری نہیں ہو سکتا - سالانہ بیرونِ ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا - "منیجر"

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے - "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے